دور جدید کے بعض مسلم مسائل

ایک بازدید

خوشتر نورانی

ادارۂ فکر اسلامی، دہلی

Ek Bazdeed
By:Khushtar Noorani
First edition in India: March 2010
Second edition in Pakistan: July 2011

Idara-e-Fikre Islami,Delhi
Distributed by:Maktaba Jaam-e-Noor
422 Matia Mahal,Jama Masjid,Delhi-6
Phone:011-23281418
email: ifikreislami@gmail.com

انتساب

محبّ گرامی

اسید الحق محمد عاصم قادری

کے نام

جن کی صحبت میں امت کے مسائل پر غور وفکر کی عادت سی پڑ گئی

فهرست

بازدید پر ایک نظر	5
اظہاریہ	7
زوال کا ادراک	9
دین کی تعبیر میں سیاسی اور دعوتی تشدد	18
لفظوں کے خلاف جنگ	32
اسلامی اقدار اور روایات کا غیر شعوری زوال	47
علماے دین کا معاشی استحکام	58
مسلمانوں کی ترقی اسلام کی ترقی نہیں	67
حقوق انسانی کے دو عالمی منشور: ایک موازنہ	85
مشرقی اقدار اور مغربی انداز نظر	101
انقلاب ۱۸۵۷ء کے حقیقی داعی	109
سیکولرائزیشن بنام اسلامائزیشن	121
دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں	136
مسلم دنیا کا ایک انوکھا سروے	150

''بازدید'' پر ایک نظر

پروفیسر اختر الواسع

صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

آزادی کے بعد پیدا ہونے والی ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل کی خاص بات یہ ہے کہ اسے صرف اپنی ہندوستانیت پر اصرار نہیں، اس کے تقاضوں، مسائل اور اس کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا ادراک بھی ہے- وہ زبانی دعووں پر نہیں عمل پر یقین رکھتی ہے- خوشتر نورانی کا تعلق ہندوستانی مسلمانوں کی اسی نئی نسل سے ہے جو ایک روایتی مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئی، لیکن جس کی خودی صورتِ فولاد اور جو اپنی زمین پر مضبوطی سے قدم جما کر ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا حوصلہ رکھتی ہے- ان کی بیشتر تعلیم کی نوعیت بھی روایتی مذہبی اور مسلکی رہی ہے، بعد ازاں انہوں نے جدید تعلیمی اداروں سے بھی خوب استفادہ کیا ہے-

انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز بھی روایتی، مذہبی اور مسلکی مسائل پر مضامین لکھنے سے کیا- البتہ خوشتر نورانی کی انفرادیت یہ ہے اور اس کی وجہ سے میں ان کی بڑی قدر کرتا ہوں کہ انہوں نے خود کو صرف مسلکی مسائل تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس حصار سے باہر قدم رکھتے ہوئے مسلمانوں کے عام اور اجتماعی مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے- وہ اپنی مسلکی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے بھی مذہبی اجتماعیت کا احترام کرتے ہیں- وہ شجر سے پیوستہ رہ کر ہی بجا طور پر بہار کی امید رکھتے ہیں، کیوں کہ شاخوں کو وہ شجر سے الگ نہیں سمجھتے - اسی لیے انہوں نے ان مسائل کو دیکھا، سمجھا، ان پر غور وفکر کیا اور اس کے بعد ممکنہ حل اور عملی اقدامات کی نشاندہی بھی کی ہے- اس دوران ان کے ساتھ ان کی صحافت بھی ایک نئے مگر زیادہ بامقصد تجربے سے دوچار ہوئی ہے-

''ایک بازدید'' خوشتر نورانی کے ان اداریوں اور مضامین کا مجموعہ ہے جو اب دہلی سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت ماہنامہ ''جام نور'' میں پچھلے برسوں کے دوران اشاعت پذیر ہوئے ہیں- ان سے صرف اس پر ہی روشنی نہیں پڑتی کہ اس دوران مسلم ملت کن اہم مسائل سے دوچار رہی ہے بلکہ ان میں مختلف مسائل کے حوالے سے امت اسلامیہ ہند کے ایک بڑے طبقے کے فکری رویے اور رجحان کی نمائندگی بھی ملتی ہے- ان میں مسلمانوں کو درپیش اہم مسائل پر قلم ہی نہیں اٹھایا گیا ہے بلکہ ان کا بڑی حد تک منصفانہ اور اعتدال پسندانہ تجزیہ کرنے اور پھر قابل عمل حل پیش کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے- مضامین کو پڑھنے کے بعد جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلۂ رحمت سے اللہ رب العزت کے حضور بس یہی دعا کی جاسکتی ہے: اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!

اختر الواسع

ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

وصدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اظہاریہ

ہم نے جس ماحول اور جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہاں امت مسلمہ کے عمومی مسائل سے زیادہ مسلکی مسائل زیر بحث رہتے تھے، گویا مسلکی معاملات، ان پر غور وفکر اور اس کی تعمیر وترقی کی سوچ ہمارا اوڑھنا بچھونا تھی- اس کا سبب حالات کے جبری تقاضے کے تحت اپنے متوارث عقائد ونظریات کا تحفظ تھا، جنھیں یکسر نظر انداز کرنے کی غلطی نہیں کی جاسکتی تھی- فطری طور پر اپنے گرد وپیش کا اثر ہمارے ذہن وفکر نے بھی قبول کیا اور انہی کے زیر اثر ہم نے شعور کی طرف قدم رکھا- زمانۂ طالب علمی میں جب ہمارا رشتہ قرطاس وقلم سے استوار ہوا تو مسلکی موضوعات ہی ہماری تحریروں کا محور قرار پائے اور تعلیم سے فراغت کے بعد جب ۲۰۰۲ء میں ہم نے جام نور کا اجرا کیا تو برسوں حواس پر یہی موضوعات حاوی رہے-

ان موضوعات ومعاملات کی افادیت اپنی جگہ، لیکن امت کے اجتماعی مسائل سے ہم جیسوں کی غفلت ایک ایسی غلطی تھی اور ہے جس کا خمیازہ مسلمانوں کی مجموعی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ کے طور پر سامنے آیا ہے- اس جمہوری عہد میں ہر شخص، ہر جماعت اور ہر تنظیم و تحریک کو دینی، ملی، سیاسی اور سماجی مسائل میں اپنے ذاتی نقطۂ نظر کی اشاعت اور اس کے دفاع وتبلیغ کا حق ہے، لیکن امت محمدیہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے امت کے اجتماعی مسائل، مثلاً تعلیم، معیشت، غربت وافلاس، مسلم پرسنل لاز، دہشت گردی، ذرائع ابلاغ اور دعوت وتبلیغ پر غور وفکر اور ان کے حل کے لیے کوشش کرنا فرض کی حیثیت رکھتا ہے- تاریخ گواہ ہے جس نے بھی ان عمومی مسائل سے چشم پوشی پر اصرار کیا اس کا وجود سمٹ کر ایک نقطے

میں منجمد ہو کر رہ گیا اور اسے مسلمانوں کے عمومی دھارے سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا-

دور جدید کے مسلم مسائل کے تعلق سے مذکورہ فکر نے ہماری سوچ کا زاویہ بدلا اور پھر ہم نے مسلکی مسائل کے ساتھ مسلمانوں کے عمومی مسائل پر غور وفکر کا آغاز کیا، جس کے نتیجے میں زیر نظر کتاب میں شامل تحریریں وجود میں آئیں اور جام نور کے ذریعے ہزاروں افراد تک پہنچیں- ان تحریروں کا تعلق مسلمانوں کے مختلف مسائل سے ہے، جن کے بارے میں ہم یہ بلند بانگ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ ان کے مطالعے سے ذہن وفکر میں یکبارگی انقلاب برپا ہوگا، ہاں! اتنا ضرور ہے کہ مسلکی اور ذاتی تنازعات کی ہنگامہ آرائیوں کے درمیان ہماری توجہات مسلم مسائل کی طرف ضرور مبذول ہوں گی اور از سر نو اپنے اجتماعی مسائل کے حل کے لیے غور وفکر کی راہیں کھلیں گی، اسی کو باز دید (نظر ثانی) کہتے ہیں، جو ہماری اجتماعی ترقی کی طرف پہلا قدم ہوگا-

خوشتر نورانی

۲۰ر فروری ۲۰۱۰ء

زوال کا ادراک

امت کے سماجی ومعاشی معیار کی بلندی کے لیے تعلیم کو مشن بنانا ہوگا

علامہ اقبال نے ''متاع کارواں'' کے لٹنے سے زیادہ ''احساس زیاں'' کے فقدان پر نوحہ کیا ہے کہ احساس زیاں اگر ہو تو متاع کارواں پھر لایا جا سکتا ہے اور منزل کی طرف پیش قدمی کی جا سکتی ہے، مگر لٹنے کا احساس ہی مٹ جائے تو منزل کی طرف کبھی جادہ پیمائی نہیں کی جا سکتی - اقلیم زندگی کی سطح پر مسلمانوں کے مذہبی، جماعتی، علمی، فکری، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور سماجی زوال کے بنیادی سبب کو اس فلسفے میں دیکھا جا سکتا ہے-

ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کی تاریخ ڈیڑھ سو سالوں پر محیط ہے، انقلاب ۱۸۵۷ء برپا کرنے کے جرم کی پاداش میں مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں جس طرح بے دست و پا کیا گیا، اس کے بعد سے آج تک وہ سنبھل نہیں سکے ہیں، مگر اس سے بھی زیادہ دل خراش حقیقت یہ ہے کہ انہیں ابھی تک اپنے زوال کے بنیادی سبب کا ادراک نہیں ہو سکا ہے، مسلمان ڈیڑھ سو برس پہلے اپنے دور اقتدار کے تحکمانہ مزاج کے ساتھ آج بھی جی رہا ہے جس کے پاس ''حقوق ادائیگی'' اور ''ذاتی محاسبے'' کی فرصت نہیں بلکہ حقوق طلبی، احتجاج، جذباتی نعرے اور شکایتوں کا ایک لامتناہی دفتر ہے جن کے ذریعے وہ اپنے عہد رفتہ کی طرف لوٹنا چاہتا ہے، مگر آج تک نہیں لوٹ سکا-

آزادی سے قبل ۱۸۸۵ء میں ہندوستان کی منتشر قوم کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر مجتمع کرنے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا، کانگریس کے اکثر رہنما ہندو تھے اور ان کی خدمات کا دائرہ ہر دور میں ہندوؤں تک ہی رہا، اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے

کہ یہ کوئی سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت نہیں تھا بلکہ اس دور کے حالات ہی ایسے تھے کہ تعلیم و ترقی کے ہراول دستے میں ہندو ہی پیش پیش تھے- گو کہ اس کی تحریک بحیثیت قوم تھی مگر اس پر ہندو رنگ غالب تھا، جبکہ کانگریس کے بالمقابل خالص مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی نمائندگی کے لیے ۳۱/دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ تشکیل دی گئی- ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوؤں کے پیش نظر صرف سیاسی آزادی اور قیادت کا مسئلہ تھا لیکن مسلمانوں کے سامنے سیاسی آزادی اور قیادت کے ساتھ مذہبی تعلیمی، سماجی، معاشی اور سیاسی پچھڑے پن پر قابو پانے کی جدوجہد اور اپنے کھوئے ہوئے حقوق کی بازیافت بھی شامل تھی- ہندو مسلم اہداف کا یہی فرق مسلم لیگ کی تشکیل کا موجب بنا، یہی فرق کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک مرکز پر مجتمع نہ کر سکا اور اسی فرق نے مملکت خداداد کی بنیاد ڈالی-

جون ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے سمجھوتے اور ہندو مسلم مفاہمت کے لیے کی گئی مشترکہ میٹنگ میں بانی پاکستان محمد علی جناح نے کانگریس کے سامنے گیارہ مطالبے رکھے تھے، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) ترانہ وندے ماترم نہیں گایا جائے گا (۲) مسلمانوں کے ذریعے گاؤکشی پر پابندی نہیں عائد کی جائے گی (۳) مسلمانوں کی مذہبی سرگرمیاں اور اذان وغیرہ کے حقوق میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کی جائے گی (۴) مسلم پرسنل لاء اور مسلم تہذیب کو دستوری سطح پر تحفظ فراہم کیا جائے (۵) ملکی مناصب اور عہدوں میں قانونی طور پر مسلمانوں کی واضح حصہ داری کو متعین کیا جائے (۶) دستوری سطح پر یہ ضمانت دی جائے کہ اردو کا استعمال کم نہیں ہوگا——— تقسیم ہند کے بعد مملکت خداداد کے قیام کی صورت میں مسلم لیگ نے یہ تمام جزوی مطالبات تو حاصل کر لیے، لیکن ہندوستان میں یہ مطالبات نہ اس وقت تسلیم کیے گئے تھے اور نہ آج تک یہ مطالبات پورے ہو سکے ہیں- اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان گیارہ مطالبات میں مسلمانوں کی ترقی اور بقا کا کوئی دائمی فارمولہ یا مطالبہ نہیں تھا جو مذکورہ جزوی مطالبات کو ہمیشہ تحفظ فراہم کرتا رہتا، وہ دائمی فارمولہ ''تعلیم'' ہو سکتا تھا، اس تحکمانہ اور فرسودہ سوچ نے پاکستان کو آزادی کے ساٹھ سال کے بعد بھی حقیقی جمہوریت سے محروم کر

رکھا ہے اور سیاسی انارکی، ہتھیار بند تحریکوں اور عوامی انتشار نے اسے معاشی، سماجی اور تعلیمی ترقیات کی بین الاقوامی دوڑ میں میدان سے باہر کر دیا ہے — جبکہ ہندوستان میں آزادی کے بعد آج تک مطالبات کی اس جزوی لسٹ کو جیب میں لیے گھومنے کی وجہ سے ہندو اور ہندوستان کی برتری کے باوجود آج تک مسلمان زوال سے دوچار ہیں اور وقفے وقفے سے ان کے مذکورہ مطالبات پر خطرے کا گدھ منڈلاتا رہتا ہے- اگر مسلمان اپنا محاسبہ کر کے زوال کی اصل بنیاد معلوم کر لیں اور اس بنیاد کو ختم کرنے کی کوشش کریں تو مذکورہ مطالبات کو دائمی تحفظ فراہم ہو سکتا ہے-

زوال کا بنیادی سبب:- نئے عہد اور حالات میں اپنے ذہن و مزاج کو تبدیل کر کے ترقی کے نئے آفاق تلاش کرنا فراست مومنانہ ہے جبکہ ذہن و فکر کا انجماد اور زمانے کے ساتھ بے ربطگی زوال کی علامت، زندگی کے ہر شعبے میں اس کلیے کے مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں- انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل مسلمان اقتدار میں تھے، ریاستیں اور جاگیریں ان کے قبضے میں تھیں، اردو اور فارسی رابطے کی زبان تھی، حکومت کے اعلیٰ مناصب پر یہی فائز تھے، تعلیم کے نام پر دینی علوم ہی مروج تھے اور حکومت و مناصب کے لیے اعلیٰ تعلیمی لیاقت شرط نہیں تھی- انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا کارواں لٹ پٹ گیا اور حالات یکسر تبدیل ہو گئے، اب نہ زمام اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی اور نہ ریاستیں اور جاگیریں، اردو فارسی کی بجائے انگریزی رابطے کی زبان ہو گئی، معاشی خوشحالی اور اعلیٰ مناصب کے لیے تعلیمی لیاقت اور مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی اولین شرطیں مان لی گئیں اور عصری تعلیم کے لیے بڑے پیمانے پر اسکول و کالجز کھول دیے گئے-

ان بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں نے مواقع سے فائدہ اٹھا کر ترقی کی نئی راہیں تلاش کرنے کی بجائے صرف شکایات اور احتجاجات کرتے رہے، انگریزوں کی مخالفت کے ساتھ انگریزی زبان کی مخالفت پر اتر آئے، عصری تعلیم سے کنارہ کش رہے، تعلیم سے یہی بے توجہی اور بیزاری ان کے زوال کا بنیادی سبب بن گئی، تعلیم سے لاپرواہی نے صرف معاشی میدان میں ہی ان کی گرفت کو کمزور نہیں کیا بلکہ سیاسی، سماجی اور علمی شعبوں

سے بھی ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، اس کے برخلاف ہندوؤں نے نئے عہد و حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال کر مواقع سے فائدہ حاصل کرنا شروع کر دیا، زندگی کی دوڑ میں ان کے اس اقدام نے انہیں کل بھی آگے رکھا اور آج بھی وہی آگے ہیں جبکہ مختلف عہد کی تبدیلیوں کے باوجود مسلمانوں کے مزاج میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی واقع نہیں ہوئی، بلکہ مسلمانوں کی نااہل قیادت اس کمزور سوچ کی ہمیشہ ملمع سازی کرتی رہی اور انہیں ایشوز سے ہٹا کر نان ایشوز پر لگائے رکھا-

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی ابتر حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے The Times لندن نے ۱۴/ اکتوبر ۱۸۷۱ء کی اشاعت میں لکھا کہ: "اگر مسلمان چاہیں تو ان کے لیے اسکولوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں جہاں وہ عصری علوم سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں، اس طرح اگر وہ چاہیں تو مقابلے کے امتحانات میں بھی شرکت کر سکتے ہیں، اگر انہیں انتظامی عہدوں سے محروم رکھا گیا ہے تو محض اس لیے کہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں وہ پچھڑ گئے اور ہم ان پر سبقت لے گئے"- (ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج ص:۳۴)

برطانوی دور حکومت میں سرکاری مناصب اور عہدوں کے لیے انگریزی سے واقفیت ضروری تھی اور مسلمان اس زبان سے بے بہرہ تھے، اس کا اندازہ اس دور کے ہر تعلیمی اعداد وشمار سے ہوتا ہے- ۱۸۷۱/۷۲ء کے تعلیمی سال میں بمبئی پریسیڈنسی کے مختلف سرکاری اداروں میں زیر تعلیم ہندو اور مسلمان طلبہ کے اعداد و شمار حسب ذیل تھے:

ڈویژن	مسلمان	ہندو
سنٹرل (مرکزی)	۲۱	۳۳۹
شمالی مشرقی	–	۴۹
شمالی	۱۳	۱۴۹
جنوبی	۱۱	۱۶۰
سندھ	۳۲	۳۹
میزان	۷۷	۷۳۶

اس تعلیمی پچھڑے پن کی وجہ سے مسلمان سماجی اور معاشی سطح پر نہایت کسمپری کی حالت میں تھے- اس صورت حال سے دل برداشتہ ہوکر سرسید (۱۸۹۸/۱۸۱۷ء) نے ۲۶ رمئی ۱۸۷۵ء کوعظیم آباد (پٹنہ) کے مسلم قائدین کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا:

''اب آپ تمام ہندوستان پر نگاہ دوڑائیے اور اس کے مختلف اداروں کو پیش نظر رکھیے، سرکاری محکموں کو لیجیے، کارخانوں یا محکمہ ریلوے کو لیجیے، چھوٹی چھوٹی دکانوں سے لے کر بڑے بڑے تجارتی مراکز کو دیکھیے یا کسی بھی قسم کے خانگی کاروبار کو لے لیجیے اور پتہ چلائیے کہ ان تمام جگہوں پر ملازمت پانے والوں میں مسلمان کتنے ہیں؟ میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ان کا تناسب ہزار میں ایک سے بڑھ کر نہیں ہوگا''-

(سرسید: لکچروں کا مجموعہ (اردو) ص:۸۶)

مسلمانوں کی سماجی اور معاشی ابتری پر ۱۵ر جولائی ۱۸۸۵ء میں حکومت نے ایک مفصل قرارداد بھی جاری کی جس میں اس نے کہا:

''ماضی میں مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں جو چیز سب سے زیادہ حائل رہی وہ یہ تھی کہ یا تو مسلمانوں میں سرکار کے مروجہ نظام تعلیمی سے بھرپور استفادہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی یا یہ کہ وہ دانستہ طور پر اس کے لیے آمادہ نہیں تھے''-

تاریخ کی بے شمار کتابوں میں ہمارے زوال کے بنیادی سبب کو مختلف حیثیتوں سے ذکر کیا گیا ہے، مگر مسلمانوں نے تعلیم سے اپنا رشتہ اس طرح منقطع کر لیا ہے کہ انہیں ان حقائق کو پڑھنے کی فرصت بھی نہیں، اس کے برخلاف وہ کل بھی صدائے احتجاج بلند کرتے رہے، عرض داشتیں پیش کرتے رہے، حکومت سے شکایتیں کرتے رہے اور آج بھی یہی کر رہے ہیں- ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے آزادی کے لیے بے شمار قربانیاں اس لیے دی تھیں تاکہ وہ آزاد ہندوستان میں خوشحال زندگی گزار سکیں، مگر مسلمانوں کی مجموعی حالت جیسی آزادی سے قبل تھی ویسی آج بھی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ کل ان کا ٹکراؤ اور ان کی شکایتیں انگریز حکومت سے تھی آج آزادی کے بعد ہر اس حکومت سے ہے جو برسر اقتدار رہے-

مسلم قیادت نے مسلمانوں کی خستہ حالی کا ٹھیکرا ہمیشہ حکومت وقت کے سر پھوڑا ہے، بدقسمتی سے یہ منفی سوچ خود مسلم عوام میں سرایت کر گئی اور پوری قوم بشمول قائدین اپنی کمیوں کا محاسبہ کر کے ترقی کرنے کی بجائے ہمیشہ حکومت وقت کی طرف آس لگائے دیکھتے رہے، حکومت نے بھی مسلمانوں کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر آزادی سے قبل بھی اور بعد بھی مسلمانوں کی پریشان حالی کا ڈاٹا پیش کر کے اسے دور کرنے کا وعدہ کیا اور مسلم ووٹ بینک کو اپنے قبضے میں کرتی رہی-

برطانوی منتظم مونسٹورٹ الفنسٹن (Monstuart Elphinston) نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں برطانوی انتظامیہ کے زیر اہتمام مسلمانوں کی زبوں حالی پر ایک رپورٹ پیش کی تھی اور انہیں ریزرویشن دے کر سماج کے مکھیہ دھارا (Mainstream) سے جوڑنے کی کوشش کی تھی- اسی طرح تقریباً ۲۵ رسال قبل اندرا گاندھی نے بھی اپنے دور اقتدار میں مائنارٹیز کی ابتر صورت حال کو صحیح کرنے کے لیے ڈاکٹر گوپال سنگھ کی قیادت میں ۱۰ر افراد پر مشتمل ایک پینل تشکیل دیا تھا جس میں ۱۴ر جون ۱۹۸۳ء کو اپنی رپورٹ پیش کی تھی، گوپال سنگھ کی سفارشات پر کوششیں بھی کی گئیں مگر وہی ڈھاک کے تین پات —— اور اب نومبر ۲۰۰۶ء میں منموہن سرکار کی طرف سے مسلمانوں کی مفلوک الحالی پر جسٹس راجندر سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی ہے، جس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ مسلمان ہر شعبے میں کس قدر پچھڑے پن کا شکار ہے، اس رپورٹ کے آتے ہی کچھ دنوں تک سیاسی بازار میں ہلچل رہی، مسلم قیادت آستین چڑھا کر اپنا حق لینے کے لیے میڈیا میں بیان دیتی رہی اور حکومت کو کوستی رہی، میڈیا مختلف جہتوں سے تجزیاتی تحریریں شائع کرتا رہا اور پھر کچھ دنوں کے بعد یہ تمام شور شرابے ختم ہو گئے اور اپنے آپ ہی سب کچھ نارمل ہو گیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو- یعنی مسلمان پہلے جس حال میں تھا اب بھی ویسا ہی ہے-

ڈیڑھ سو برس کے اس طویل عرصے میں مختلف حادثات و واقعات سے باشعور مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ جب تک وہ اپنی صورت حال کی تبدیلی کے لیے خود کچھ نہیں کرتے، کوئی ناخدا انہیں اس بھنور سے نکال نہیں سکتا اور اس طوفان سے نکلنے کا سہارا صرف

تعلیم ہے۔مسلمان اگر اعلیٰ تعلیم سے لیس ہوں گے تو کوئی مقابلہ جاتی امتحان یا تعصب انہیں زندگی کے کسی بھی شعبے میں آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتا اور ان کے سماجی اور مذہبی حقوق پر سیندھ نہیں لگایا جا سکتا۔

بنیادی مطالبے کا نتیجہ:۔امریکہ کے شمالی حصے میں بوسٹن شہر آباد ہے،موجودہ عہد کی دو عظیم تعلیمی درسگاہیں یہاں موجود ہیں، ہارورڈ یونیورسٹی اور ایم آئی ٹی۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے اور پڑھانے والے ہر دم نئی کہکشاؤں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔۱۹۴۷ء کے بعد جب مغربی دنیا نے ہندوستان پر مہربان ہو کر اس کی مدد کرنا چاہی تو اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے فوراً ایم آئی ٹی کی طرح ٹیکنالوجی کی تعلیم دینے والے چھ اداروں کا مطالبہ کر دیا، دھیرے دھیرے بنگلور میں ایک کے بعد ایک یہ تمام ادارے نہ صرف وجود میں آئے بلکہ ان اداروں میں نہایت اعلیٰ سطحی معیار تعلیم کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ اب ان اداروں میں داخلہ لینے والوں کے جنون کا یہ حال ہے کہ پچھلے سال (۲۰۰۶/ ۲۰۰۵ء) ایک لاکھ اٹھتر ہزار امیدواروں نے اس کے مقابلہ جاتی امتحان میں حصہ لیا جس میں سے صرف ساڑھے تین ہزار کو داخلہ مل سکا۔آج ان اداروں کی وجہ سے بنگلور کو نہ صرف کیلی فورنیا کی سیلی کون وادی (جو انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صنعت میں سرفہرست ہے) کے برابر لا کھڑا کیا بلکہ سیلی کون وادی میں ایک اندازے کے مطابق اس وقت ایک لاکھ بیس ہزار ماہرین کام کر رہے ہیں جبکہ بنگلور میں ان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہو گئی ہے۔ ہندوستان شعبۂ کمپیوٹر میں خدمات (I.T. Service) کی برآمد سے اب سات ارب ڈالر کما رہا ہے۔ اس شعبے کی معروف مشاورتی فرم مکنزے Mckinsey نے اندازہ لگایا ہے کہ ۲۰۰۸ء تک ہندوستان آئی ٹی برامدات سے دس ارب سے زائد ڈالر کما رہا ہوگا۔

برسوں پہلے پنڈت نہرو کے ایک تعلیمی مطالبے نے آج پوری دنیا میں ہندوستان کو تعلیمی اور معاشی سطح پر اس قدر مستحکم کر دیا ہے کہ ایشیائی ممالک میں اپنے مجموعی ڈیویلپ منٹ کی وجہ سے پوری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے، پوری دنیا بالخصوص یورپ و امریکہ میں I.T. سیکٹر کے اندر ہندوستانی ماہرین کی بے حد مانگ ہے۔ نہرو چاہتے تو

مغرب سے کچھ اور بھی مانگ سکتے تھے مگر اس کی حیثیت جز وقتی ہوتی جس پر دائمی ترقی کا محل نہیں کھڑا کیا جا سکتا تھا۔

زوال سے سبق:۔مغربی دنیا میں تعلیم کا تناسب نوے سے سو فیصدی کے درمیان ہے، کیونکہ انہیں احساس ہے کہ ملکی اور عوامی خوشحالی اور ترقی کی بنیاد تعلیم ہی ہے۔تعلیم کے میدان میں انگلینڈ بھی صدیوں تک صف اول میں رہا ہے، مگر اب کئی دہائیوں سے ان میں یہ احساس سرایت کر گیا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر اور خوب سے خوب تر کی دوڑ میں کہیں پیچھے رہ گئے ہیں، خلاف واقعہ اس پچھڑے پن کا احساس ان میں اتنا شدید تھا کہ ٹونی بلیئر نے اقتدار سنبھالتے ہی سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ ''میری ترجیحات میں تعلیم، تعلیم اور تعلیم سرفہرست ہوگی''۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپانی قوم امریکی نفرت پر اٹھی اور دسمبر ۱۹۴۱ء میں انہوں نے امریکہ کے بحری اڈہ ہاربر پر حملہ کر کے اس کو برباد کر دیا، جوابی کاروائی میں امریکہ نے جاپان کے ہیروشیما کو نشانہ بنایا اور اسے تباہ کر ڈالا، دونوں ملکوں کے درمیان برسوں تک جنگ چھڑی رہی بالآخر ۱۹۴۵ء میں جاپان کی شکست پر جنگ ختم ہوئی۔احساس شکست کے نتیجے میں ایک صورت تو یہ تھی کہ جاپانی حکومت اور قوم میں امریکہ کے خلاف مزید نفرت پیدا ہوتی اور ان میں انتقامی کاروائی کا جذبہ فزوں تر ہوتا، مگر ان کے مدبرین جانتے تھے کہ ایسے جذبے سے سوائے بربادی اور زوال کے کچھ نہیں ہاتھ آئے گا، انہوں نے اس کے برعکس امریکہ اور ان تمام ملکوں سے مفاہمت کا طریقہ اختیار کیا جو دوسری عالمی جنگ میں اس سے متصادم تھے اور اپنی اس پالیسی کو عمل معکوس Reverse Course کا نام دیا۔ان کی موافقت میں اس نے اپنی تمام تر توجہ تعلیم اور ٹیکنالوجی پر رکھی آج اس کا نتیجہ ہے کہ جو ملک دوسری عالمی جنگ میں شکست کھا کر نکلا تھا وہ دنیا کے سامنے آج فاتح بن کر کھڑا ہے، جاپانیوں نے ٹیکنالوجی میں آج وہ مہارت حاصل کر لی ہے کہ قدرتی وسائل نہ ہونے کے باوجود انہوں نے صنعتی میدان میں سب کو شکست دے دی ہے۔

یہ دونوں حقائق دراصل تمثیلی علامات ہیں ہم مسلمانوں کے لیے جنہوں نے ۱۸۵۷ء

کے بعد اپنی مسلسل شکست وریخت سے سبق حاصل نہیں کیا اور آج تک اپنے زوال کا بنیادی سبب تلاش کر کے اس کا مداوا نہیں کر سکے —— زوال امت کے اسباب کے حوالے سے اہل علم ودانش کی اب تک مختلف تحریریں میری نظر سے گزر چکی ہیں، میرا اندازہ ہے کہ اکثر اصحاب رائے اس مسئلہ میں افراط وتفریط کے شکار ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ امت آج ہر سطح پر زوال سے دوچار ہوئی ہے، اب جو شخص جس شعبے سے متعلق ہے اسی میں زوال وپسماندگی کو زوال امت کی بنیادی وجہ قرار دیتا ہے اور دوسرے شعبوں میں زوال کو وہ اہمیت نہیں دیتا- میری گذارشات کا تعلق امت کے سماجی ومعاشی انحطاط سے ہے، اس لیے امت کی سماجی ومعاشی سطح کی بلندی کے لیے ہمیں تعلیم، تعلیم اور صرف تعلیم کو ہی اپنا مشن بنانا ہوگا-

❑❑❑

دین کی تعبیر میں سیاسی اور دعوتی تشدد

مولانا مودودی اور مولانا وحید الدین خاں کے افکار کا اجمالی جائزہ

اس مشاہداتی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے معروضی اسلوب، دعوتی فکر و نظر اور سائنسی و منطقی استدلال کی وجہ سے بیسویں صدی میں مولانا مودودی کے لٹریچر کے بعد اگر کسی لٹریچر کو تعلیم یافتہ طبقے میں مقبولیت اور پذیرائی ملی ہے تو وہ مولانا وحید الدین خاں کا ہے- لیکن یہ بھی حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اپنے اسلوب اور فکر ونظر کی انفرادیت کی وجہ سے جتنی تیزی سے ان دونوں کی مقبولیت کا گراف چڑھا اتنی ہی تیزی سے گرتا چلا گیا اور دونوں کو اپنے اپنے مشن میں، دہائیاں گزر جانے کے باوجود، اب تک قابل قدر کامیابی نہیں مل سکی- قرآن کی چار بنیادی اصطلاحوں رب، اللہ، عبادت اور دین کی سیاسی تعبیر کرنے والے مودودی صاحب نے سیاسی قوت اور ریاست کو بزور قائم کرنے کے لیے ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی اور آج ۶۸ برس گزر جانے کے بعد بھی جماعت اسلامی نہ تو سیاسی قوت حاصل کر پائی ہے اور نہ اسلامی ریاست کی تشکیل کر سکی ہے اور نہ ہی مستقبل قریب یا بعید میں اس کے آثار وقرائن ہیں- مودودی صاحب کی اپنے مشن میں ناکامی کی وجہ سے امت کے کبار علما کے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ انہوں نے قرآن کی مذکورہ اصطلاحوں کی جو تعبیر پیش کی ہے وہ نہ صرف غیر واقعی اور غیر فطری ہے بلکہ مولانا کی اس تعبیر سے دین بھی مجروح ہوا ہے، ورنہ کیا وجہ ہے کہ ان کے پاس ہمہ جہت تنظیمی وتحریکی وسائل اور افرادی قوت ہونے کے باوجود جزوی طور پر بھی ہندوستان میں اور کلی طور پر پاکستان میں کامیابی نہ مل سکی-

دوسرے اسکالر مولانا وحید الدین خاں ہیں جو تقریباً پندرہ سالوں تک جماعت اسلامی سے وابستہ رہنے کے بعد مودودی صاحب کی مذکورہ سیاسی تعبیر سے اختلاف کرتے ہوئے ۱۹۶۲ء میں اس سے مستعفی ہو گئے اور اس کے معاً بعد ۱۹۶۳ء میں مودودی صاحب کے افکار اور دین کی سیاسی تعبیر کے خلاف ایک نہایت جامع کتاب ''تعبیر کی غلطی'' لکھی جسے ہند و پاک میں غیر معمولی پذیرائی ملی- جماعت اسلامی اور اس کے مودودی افکار سے خاں صاحب کو کس قدر دلی اور جذباتی لگاؤ، محبت اور عقیدت تھی اس کا اندازہ ''تعبیر کی غلطی'' میں اولین صفحہ پر ان کے اس اعتراف سے ہوتا ہے:

''اس کتاب کی اشاعت میرے اوپر کتنی سخت ہے اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے شائع ہونے کے بعد میں کسی ایسی جگہ جا کر چھپ جاؤں جہاں کوئی شخص مجھے نہ دیکھے اور پھر اسی حال میں مر جاؤں''-

اس کے بعد سے آج (الرسالہ کے شمارہ اکتوبر ۲۰۰۷ء) تک مودودی صاحب کی سیاسی تعبیر کے خلاف خاں صاحب شد و مد سے لکھتے چلے آ رہے ہیں، گویا یہاں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مودودی صاحب کی طرف سے ان کی عقیدت اور فہم کو ٹھیس لگنے کے بعد دین کی سیاسی تعبیر کی تردید کو انہوں نے اپنی زندگی کا اولین مشن بنالیا ہے- خاں صاحب نے چونکہ مودودی صاحب کے بالمقابل اپنے مشن ''الرسالہ'' (دعوت) کی بنیاد رکھی، اس لیے نفسیاتی طور پر اسلام کے بنیادی مآخذ، سائنسی مشاہدات اور دنیاوی احوال و حوادث کے بین السطور سے کہیں آسانی سے اور کہیں کھینچ تان کر اپنے دعوتی اور اعراضی موقف کو مبرہن کرتے رہے ہیں- خاں صاحب کو مودودی صاحب سے یہ شکایت رہی کہ انہوں نے اپنے ذاتی مطالعے کے بعد دین کے سلسلے میں ایک نقطہ نظر (Mindset) بنالیا ہے اور وہ ہے ''نظام'' جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی قوت اور اسلامی ریاست کی تشکیل کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا اور اب وہ جو کچھ بھی پڑھتے یا لکھتے ہیں اسی فریم ورک میں پڑھتے اور لکھتے ہیں، جس سے دین مجروح ہوتا ہے، کیونکہ ''نظام'' دین کا بنیادی مقصود نہیں بلکہ اضافی ہے- دونوں کے موقف

کے تقابلی مطالعہ کے بعد بعینہ یہی شکایت مجھے خاں صاحب سے ہے، مودودی صاحب کے ''سیاسی ایمپائر'' کی تشکیل کے موقف کے بالمقابل انہوں نے ''دعوہ ایمپائر'' کے قیام کا موقف اپنایا اور اس موقف میں وہ اس حد تک چلے گئے کہ قرآن کی کوئی آیت ہو یا حدیث کی کوئی عبارت، سائنسی تھیوری ہو یا سیاسی بیان، احوال دنیا ہو یا حوادث عالم، ہر شئی کو وہ دعوہ فریم ورک میں دیکھنے کے عادی ہو گئے اور پھر یہ عادت فطری طور پر انہیں ہر شئی کی تعبیر و تشکیل اسی مناسبت سے کرنے پر اکساتی رہی، جس کے نتیجے میں کئی مقام پر وہ شرعی حدود سے تجاوز کر گئے- اس تجاوز کا نتیجہ یہ ہوا کہ چہ جائے کہ وہ ایک دعوہ ایمپائر قائم کرنے کی فضا بناتے، دینی حلقے کے تقریباً ہر ذی علم آدمی کو انہوں نے اپنا دشمن بنالیا- نہ وہ خود کسی کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ کوئی دوسری معقول دینی و علمی شخصیت انہیں تسلیم کرتی ہے-

تجاوز کی ایک تازہ مثال ''الرسالہ'' جون ۲۰۰۷ء کا شمارہ ہے، جس میں مولانا نے ''مسیحی ماڈل کی آمد ثانی'' کے عنوان سے قرآن کی جو تشریح کی ہے وہ قرن اول سے آج تک کسی معتبر مفسر یا محدث نے نہیں کی، مولانا نے اپنے نظریۂ دعوت کی تبلیغ کے لیے پیغمبر اعظم ﷺ کے طریقے اور منہاج کے موجودہ زمانے میں قابل عمل ہونے کا انکار کرتے ہوئے مسیحی منہاج یا طریقے کو اپنانے کے لیے زور دیا، کیونکہ (ان کے بقول) محمدی ماڈل کی ترتیب یہ تھی، دعوت، ہجرت، جہاد (بمعنی قتال) اور فتح، جب کہ مسیحی ماڈل کے آغاز میں بھی دعوت ہے اور انجام میں بھی دعوت- اب چونکہ ماڈرن نیشنل ازم نے ہجرت اور قتال جیسے طریقے کو ناممکن بنا دیا ہے، اس لیے اہل اسلام پر امن تدبیروں یعنی مسیحی منہاج کے ذریعے ہی، جس کے آغاز و انجام میں دعوت ہے، ایک دعوہ ایمپائر کھڑا کر سکتے ہیں -مولانا نے اپنی اس مخصوص دعوتی فکر کو قرآنی آیت سے بھی ثابت کرنے کی کوشش ہے، ان کے تجاوز کو جاننے کے لیے صبر کے ساتھ ذیل کا یہ اقتباس پڑھیے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''آپ بلا شبہ آخری پیغمبر (Final Prophet) تھے- لیکن آپ ہر صورت حال کے لیے آخری نمونہ (Final model) نہ تھے، چنانچہ قرآن میں آپ کے لیے 'اسوۂ حسنہ' کا لفظ آیا ہے، نہ کہ اسوۂ کاملہ کا- (الاحزاب:۲۱) کسی

پیغمبر کو فائنل ماڈل سمجھنا خدا کے قائم کردہ قانون فطرت کی تنسیخ کے ہم معنی ہے، ایسی تنسیخ ممکن نہیں، اس لیے عملی اعتبار سے کسی پیغمبر کا فائنل ماڈل ہونا بھی ممکن نہیں، فائنل پرافٹ کا تعلق، دین کے نظریاتی حصے سے ہے اور نظریاتی اعتبار سے بلا شبہ ایک پیغمبر فائنل پیغمبر ہوسکتا ہے، لیکن ماڈل کا تعلق، خارجی حالات سے ہے، یہ حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لیے عملی اعتبار سے کوئی ایک پیغمبر فائنل ماڈل نہیں بن سکتا- قرآن کی اصطلاح کے مطابق، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم 'الدّین' کے اعتبار سے فائنل پیغمبر تھے لیکن ''منہاج'' کے اعتبار سے آپ فائنل ماڈل نہ تھے- غالبًا یہی وجہ ہے کہ حدیث میں یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ آخری زمانے میں مسیح دوبارہ نازل ہوں گے- جیسا کہ معلوم ہے پیغمبر آخر الزماں کا زمانۂ نبوت قیامت تک ہے، اس لیے اب آپ کے بعد کسی اور پیغمبر کا شخصی طور پر آنا نا قابل فہم بات ہے، اس لیے ان روایات کو درست مانتے ہوئے ان کی صحیح تاویل یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں جو چیز واقع ہوگی، وہ مسیح کی آمد ثانی نہیں ہے، بلکہ مسیح کے ماڈل کی آمد ثانی ہے، یعنی بعد کے زمانے میں حالات کے اندر ایسی تبدیلیاں واقع ہوں گی کہ حالات کے اعتبار سے حضرت مسیح کا عملی ماڈل زیادہ قابل انطباق (applicable) بن جائے گا''-

مولانا کی اس تشریح سے ہندوستان کے طول وعرض میں سراسیمگی پھیل گئی، مختلف اخبارات ورسائل میں مولانا کے خلاف مراسلات چھپے، کچھ لوگ ان کی تشریح کے خلاف دارالافتاء سے رجوع کرنے کی تیاریوں میں لگ گئے، لیکن ان کی تشریح کی تردید میں جام نور (شمارہ جولائی ۲۰۰۷ء) کے علاوہ کوئی مستقل قابل اعتنا تحریر نظر نہیں آئی، اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ اکثر علما اور دانش وران نے ان کے بارے میں یہ رائے قائم کرلی ہے کہ عمر اور فکر کی جس دہلیز پر وہ کھڑے ہیں وہاں سے واپسی کے سارے راستے عموماً بند ہوجاتے ہیں، پھر سیاسی ایمپائر کے خلاف دعوہ ایمپائر کی تشکیل کے دھن میں برسوں سے مولانا ایسی باتیں

کر رہے ہیں جن کو علما نے ''ہفوات'' قرار دے کر اس پر تبصرہ کرنا ہی بند کر دیا ہے- مولانا کی مذکورہ تشریح اور اقتباس کے تعلق سے مجھے الگ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ جام نور کے شمارہ جولائی میں مولانا ذیشان احمد مصباحی نے اس تشریح پر معروضی پیرائے میں تفصیل کے ساتھ اپنی انتقادی تحریر پیش کردی ہے، اب اس پر مزید کچھ کہنا تحصیل حاصل ہوگی-

مولانا مودودی اور خاں صاحب کی تحریک اور ان کی زندگی کا تقابلی مطالعہ آسانی سے اس نتیجے پر پہنچا تا ہے کہ موخر الذکر کا دین کی تعبیر میں دعوتی تشدد دراصل اول الذکر کے سیاسی تشدد کا ردعمل ہے- مودودی صاحب نے دین کی تعبیر ایک مکمل نظام سے کی، جو نظام سیاسی قوت کے حصول اور اسلامی ریاست کی تشکیل کے بغیر ممکن نہیں اور قرن اول سے آج تک جتنے کبار علما، مفسرین اور محدثین گزرے ہیں سبھوں سے وہ اس بات کے شاکی رہے کہ انہوں نے دین کے جزوی اور ثانوی مفہوم (عقیدہ، ایمان، اخلاق اور عبادت) پر قناعت کرلی اور وہ تمام کے تمام کبار مفسرین اور علما قرآن کی بنیادی اصطلاحوں کو سمجھ نہ سکے —— دین کا ایک نظام ہونا بذات خود غلط نہیں، مگر اس نظام کو دین کا سبب جامع ماننا کہ اسی سے دین کے متفرق اجزا ایک کل میں سموتے ہیں، بالکل اسلام کے منشا کے برعکس اور غلط ہے، اس سیاسی تعبیر سے دین کی حقیقی تعبیر ہی الٹ گئی اور عقیدہ، ایمان، اخلاق اور عبادت جو دین کا مقصود حقیقی واصلی ہے وہ ثانوی و جزوی قرار پا گیا اور نظام کے لیے ریاست اسلامی کی تشکیل جو دین کا اضافی اور جزوی تقاضا تھا وہ دین کا بنیادی مقصد بن گیا-

مودودی صاحب دین کی اس الٹی سیاسی تعبیر کو زمین پر اتارنے کے لیے اپنی کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' صفحہ: ۱۱۷، ۱۱۸ میں جو نکات آفرینی کی ہے، اس کی تلخیص ''مولانا مودودی، شخصیت اور تحریک'' میں اس طرح پیش کی گئی ہے:

۱- اسلام چونکہ عقائد کے ساتھ ساتھ قانون بھی ہے اس لیے اسے نوک زبان کے ساتھ ساتھ نوک سنان سے بھی کام لینا پڑتا ہے-

۲- سرکش انسان کو اسلام کے عقائد سے زیادہ بُعد نہیں ہے، اسے اسلام کے قوانین سے

زیادہ بُعد ہے۔

۳- داعی اسلام محمد ﷺ نے ہر ممکن طریقہ اور ہر حکمت سے اسلام کی دعوت پیش کی مگر لوگوں نے نہیں مانا اور جب آپ نے تلوار ہاتھ میں لی اور حکومت قائم کر کے اخلاقی قوانین کو بزور نافذ کیا تو آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور حق کا نور عیاں ہو گیا۔

۴- عرب کے علاوہ دنیا کے دوسرے ملکوں نے بھی سرعت کے ساتھ اسلام اس لیے قبول کیا کہ اسلام کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے۔

۵- جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کی زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

مولانا مودودی کی دین کی سیاسی تعبیر اور اس تعبیر کی عملی تشکیل کے لیے جہاد بمعنی قتال کی فکر سے خاں صاحب پندرہ برسوں تک وابستہ رہے، قرآنیات کے مطالعے کی روشنی میں جب انہیں مودودی صاحب کی غلط فکری کا شدید احساس ہوا تو نفسیاتی طور پر وہ ہر اس حقیقت اور نظریہ کا رد کرنے لگے جس کو مودودی صاحب نے اپنی سیاسی تعبیر کی حمایت میں پیش کیا تھا۔ اس نفسیاتی ردعمل کا حالیہ انتہا پسندانہ نمونہ ''محمدی منہاج'' کا انکار ہے، کیونکہ حضور سرور کونین ﷺ نے اسلام کی سربلندی اور استحکام کے لیے دفاعی جنگیں لڑی تھیں اور ہجرت بھی کی تھیں۔ اور مودودی صاحب بھی نظام دین کے قیام میں اسلامی ریاست کی تشکیل کو خواہ شمشیر وسناں کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو، اولین اور ضروری مانتے ہیں اور تمثیل میں محمدی منہاج کو پیش کرتے ہیں، نیز اسلامی ریاست کی عملی کوششوں کے لیے انہوں نے تقسیم ہند کے بعد پاکستان کی طرف ہجرت بھی کی۔ اس فکری اور عملی تمثیل کا اثر یہ ہوا کہ خاں صاحب نے موجودہ حالات میں امت کے لیے محمدی منہاج کا ہی انکار کر دیا کہ وہ شاخ ہی نہ رہے جس پر آشیانہ تعمیر کیا جا سکے۔

اس انکار سے ہندوستان کے بیشتر حصوں میں تحریری اور زبانی طور پر اہل علم وقلم نے اپنی بے چینی اور اضطراب کا مظاہرہ کیا، جس کے نتیجے میں خاں صاحب نے ''الرسالہ'' کے حالیہ اکتوبر ۲۰۰۷ء کے شمارے میں اپنی مذکورہ فکر پر ملک گیر سطح پر کسی بے چینی یا ردعمل کا

تذکرہ کیے بغیر اس انکار کی مثالوں سے مزید تائید وتشریح کی ہے۔ خاں صاحب کی اس تازہ تحریر کو پڑھنے کے بعد فوری طور پر اندازہ ہو گیا کہ موصوف اپنی اس فکر کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں مزید الجھاؤ کا شکار ہو گئے ہیں اور ایسا اس لیے ہوا ہے کہ ''منہاج'' کو سمجھنے میں ہی ان سے غلطی ہو گئی ہے اور جب منہاج کو سمجھنے میں ہی وہ بنیادی غلطی کر بیٹھے ہیں تو پھر ان کی فکر اور مثالوں کے درمیان کیونکر مطابقت پیدا ہو سکتی ہے؟ مولانا اکتوبر کے شمارے میں ''دین اور منہاج'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:

''ہر پیغمبر کو خدا نے الگ الگ منہاج دیے: **لکل جعلنا منکم شرعۃً و منھاجاً** (المائدۃ:۴۸) اس سے معلوم ہوا کہ دین خداوندی کے دو حصے ہیں۔ ایک الدین اور دوسرا منہاج۔ الدین ابدی طور پر ایک ہی رہتا ہے، لیکن منہاج یا طریق کار (method) کا تعلق وقت کے حالات سے ہوتا ہے، اس لیے حالات کی تبدیلی کے تحت اس میں فرق ہوتا رہتا ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے منہاج یا طریق کار میں حالات کے حساب سے تبدیلی کی چند مثالیں دی ہیں، جن کی تلخیص اس طرح ہوگی:

۱- غزوۂ بدر کے لیے پیغمبر اسلام نے اپنے اصحاب کے ساتھ مدینے سے کوچ کر کے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا تو ایک صحابی نے آپ سے پوچھا کہ کیا یہ پڑاؤ وحی کی بنیاد پر ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، تو مذکورہ صحابی نے پڑاؤ کی جگہ کو نامناسب ہونے کی بنیاد پر تبدیل کرنے کو کہا اور آپ نے بدل دیا۔

۲- غزوۂ احزاب کے موقع پر مخالفین کی بڑی فوج اہل ایمان سے مقابلے کے لیے مدینے کی طرف روانہ ہوئی، جبکہ مسلمان ان سے لڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، جنگ کو ٹالنے کے لیے اصحاب نے خندق کھودنے کا مشورہ دیا، جسے آپ نے حالات کے مطابق قبول فرمایا۔

۳- مدینے میں لوگ کھجوروں کے درختوں کی زرخیزی کے لیے تأبیر یا تلقیح کا عمل کیا کرتے تھے، حضور نے اپنی آمد کے بعد اس عمل کو چھوڑنے کے لیے کہا جس کی وجہ

سے فصل کم ہوئی، حضور نے کمی کا سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ تلقیح نہ ہونے کے سبب یہ ہوا ہے تو پھر حضور نے اس کی اجازت مرحمت فرمادی۔

پھر مثالیں دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ: ''اس قسم کے واقعات بتاتے ہیں کہ جہاں تک الدین کا تعلق ہے، اس معاملے میں پیغمبر اسلام کا اسوہ ایک کامل اور ابدی اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے۔لیکن جہاں تک منہاج یا طریق کار کا تعلق ہے، اس میں حقیقی حالات کی نسبت سے یہ متعین ہوگا کہ کس وقت کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔'' پھر مزید چند مثالیں دیتے ہیں کہ:

۴۔ پیغمبر اسلام جب مکہ میں تھے تو کعبہ کے بتوں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی اور جب مکہ فتح ہوا تو حالات کی مناسبت سے بتوں کو کعبہ سے نکال دیا۔

۵۔ حضور نے ابتدائی زمانہ میں فرمایا تھا کہ ہم امی ہیں ہم نہ لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں ،لیکن حضرت عمر فاروق کے عہد میں اسلامی سلطنت کے دفتروں میں ایرانی اور رومی نقشے پر حساب درج ہوتا تھا۔

۶۔ بنوامیہ کے زمانے میں بحری بیڑا تیار کیا گیا حالانکہ اس سے پہلے اسلام میں ایسا نہیں ہوا۔ بنوعباس کے زمانے میں بغداد میں رصدگاہ بنائی گئی۔خوارزم کے زمانے میں سمرقند میں کاغذ کا کارخانہ بنایا گیا۔اندلس کی مسلم حکومت کے زمانے میں آب پاشی کے نئے طریقے اختیار کیے گئے۔

۷۔ پہلے نبوت اور دعوت حق کے اعلان کے لیے حضور صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہوئے جبکہ آج اسی کام کے لیے ٹیلی ویژن کا سہارا لیا جاتا ہے۔

قرآنی منہاج کی اتنی پھسپھسی اور کچی مثالیں کسی نوآموز کے فکر وقلم کا زائدہ ہوتیں تو اہل علم نہ اس پر توجہ دیتے اور نہ انہیں اس پر خاصی حیرت ہوتی ، لیکن خاں صاحب جیسے مضبوط صاحب فکر وقلم سے اس طرح کی مثالیں یقیناً حیرت انگیز ہیں ۔قرآن میں جس منہاج کا ذکر ہے اگر اسی کو کہتے ہیں جس طرح کی مثالیں دی گئی ہیں تو پھر موجودہ زمانے کی تخصیص کیا؟ یقیناً امت محمدیہ نے حضور کی وفات کے بعد ہی محمدی منہاج کو ترک کر دیا

تھا۔مثلاً

۱۔ عہد رسالت میں لوگ چمڑے اور ہڈیوں پر لکھا کرتے تھے، بعد کے زمانے میں کاغذوں پر لکھنا شروع کر دیا۔

۲۔ پہلے گھوڑوں اور اونٹوں پر سفر کرتے تھے، بعد میں موٹر گاڑی، ریل اور ہوائی جہاز پر سفر کرنے لگے۔

۳۔ پہلے پیغام رسانی کے لیے قاصد ہوا کرتے تھے، بعد میں ڈاک کا نظام اور پھر فون، موبائل اور انٹرنیٹ کا دور آگیا۔

۴۔ پہلے گھاس پھوس اور چھپر کے مکانات ہوا کرتے تھے، بعد کے ادوار میں اینٹ اور گارے سے عالی شان عمارتیں بننے لگیں وغیرہ۔

خاں صاحب کی دی گئی مثالوں اور بعد کی مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن میں جس منہاج کا ذکر ہے اس کا مقصود ومطلوب یہ نہیں، یہ تو دین وشریعت اور زندگی کے مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کے ذرائع (Matter of convenience) ہیں، جن میں ہر دن جزوی اور ہر عہد میں کلی تبدیلی ہوتی رہتی ہے — خاں صاحب نے منہاج کی تبدیلی کے لیے قرآن کی جس آیت سے استدلال کیا ہے وہ ہے: **لکل جعلنا منکم شرعۃً و منھاجا** اور اس کا ترجمہ اپنی تفسیر ''تذکیر القرآن'' میں یوں فرمایا ہے: ''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک طریقہ ٹھہرایا'' — خاں صاحب نے دعوت کے زمانی ذرائع کو قرآنی منہاج سمجھ کر جو مثالیں دی ہیں خود انہی کے مذکورہ ترجمے سے ان کی نفی ہو رہی ہے، کیونکہ قرآن کا اگر وہی مطلوب ہوتا جو خاں صاحب سمجھ رہے ہیں تو پھر یہ منہاج ہر عہد میں ہر شخص کے ساتھ تبدیل ہو جاتا ہے، اس میں نبیوں اور رسولوں کی ہی کیا تخصیص؟ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ قرآنی منہاج یہ نہیں بلکہ کچھ اور ہے، یہ تو دعوت کے زمانی ذرائع ہیں جو ہر عہد بلکہ سال دو سال میں حالات کے مطابق تبدیل اور موڈرنائز ہوتے رہتے ہیں۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں منہاج کے تعلق سے احادیث وآثار پر مشتمل لکھی گئیں اولین دور کی مستند تفاسیر کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ منہاج کا مفہوم دعوت کے

زمانی ذرائع نہیں بلکہ اوامر ونواہی پر مشتمل ''شرعی احکام'' ہیں، مذکورہ آیت میں شریعت و منہاج کے تعلق سے تفسیر ابن کثیر میں یوں تشریح کی گئی: **هذا اخبار عن الامم المختلفة الاديان باعتبار مابعث الله به رسله الكرام من الشرائع المختلفة فى الاحكام المتفقة فى التوحيد ـــــ وأما الشرائع فمختلفة فى الأوامر والنواهى فقد يكون الشئى فى هذه الشريعة حراماً، ثم يحل فى الشريعة الاخرىٰ، وبالعكس** (ص:۶۲)

یعنی عقیدۂ توحید جسے دین سے تعبیر کیا گیا ہے اس کی تعلیم تو ہر رسول کو یکساں طور پر دی گئی، اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں، لیکن منہاج وشریعت یعنی اوامر ونواہی پر مشتمل احکام ہر رسول کو الگ الگ دیے گئے، یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ کسی کی شریعت میں جو چیزیں حلال تھیں وہ دوسری شریعت میں حرام ہوگئیں اور جو حرام تھیں وہ حلال ہوگئیں- رسولوں کے درمیان منہاج (احکام شرعی) کے اسی فرق کو قرآن نے آیت **لكل جعلنا منكم شرعة و منهاجا** میں بیان کیا ہے-

مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں بھائی بہن کے درمیان شادی جائز تھی مگر حضرت موسیٰ کی شریعت میں یہ حکم ختم کر دیا گیا- اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت میں صرف خون حرام تھا، جانور نہیں، لیکن بعد کی شریعتوں میں بعض جانوروں کو بھی حرام قرار دے دیا گیا- اسی طرح نماز کے لیے قبلہ اور سجدہ گاہ کی تعیین کا مسئلہ ہے-

لطف کی بات یہ ہے کہ منہاج سے مراد احکام شرعیہ ہی ہیں اس کا جزوی اعتراف غیر شعوری طور پر خود خاں صاحب نے اپنی تحریر میں بھی کر دیا ہے: وہ الدین اور منہاج کا فرق بتاتے بتاتے یہ لکھ گئے کہ:

''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا دوسرا حصہ وہ ہے، جس کا تعلق منہاج یا طریق کار سے ہے، اس معاملے میں آپ نے رہ نما اصول مقرر فرما دیے ہیں، لیکن جہاں تک عملی طریقے کا تعلق ہے وہ علماء امت کا کام ہے- ہر زمانے کے علماء حالات کے اعتبار سے اس منہاج یا طریق کار کو اختیار کریں

گے جو ان کو حالات کے اعتبار سے موثر اور مفید نظر آئے''-(ص:۵)

رہ نما اصول مقرر فرما دینے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ شریعت کے بنیادی احکام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن اور اپنے اقوال، افعال اور احوال کے ذریعے قیامت تک اپنی امت کے لیے مقرر فرما دیے ہیں- لیکن حالات کے اعتبار سے علماء کی رائے پر ان احکام کی تعمیل اور تنفیذ کے طریقے بدلتے جاتے ہیں- مثلاً عہد رسالت میں زکوٰۃ کی وصولیابی کے لیے باقاعدہ افراد مقرر تھے جو زکوٰۃ وصول کر بیت المال میں جمع کیا کرتے تھے، پھر قرآنی احکام کے مطابق مستحقین کو بیت المال سے زکوٰۃ کی تقسیم ہوتی تھی- لیکن بعد کے ادوار میں بیت المال کا نظریہ ختم کر دیا گا اور اس کی جگہ انفرادی طور پر لوگ زکوٰۃ تقسیم کرنے لگے- یہاں زکوٰۃ کی ادائیگی کا بنیادی حکم تو تبدیل نہیں ہوا، لیکن اس کی تعمیل کے طریقے حالات کے حساب سے بدل گئے-

اگر غیر شعوری طور پر منہاج سے مولانا کی مراد احکام شرعیہ نہیں تو پھر ان کی دی گئی منہاج کی مثالوں میں زمانی ذرائع کو حالات کے اعتبار سے ہر شخص اختیار کرتا ہے، اس میں علماء کی ہی کیا خصوصیت؟ مثال کے طور پر وحی نہ ہونے کی صورت میں پڑاؤ کی جگہ تبدیل کرنا، جنگ کو ٹالنے کے لیے تدبیر اختیار کرنا، فصل کی کمی کی وجہ سے مناسب عمل کرنا، حساب وکتاب کرنے کے لیے موجودہ آلہ مثلاً Calculator یا کمپیوٹر استعمال کرنا، فلکیات کے احوال معلوم کرنے کے لیے رصدگاہیں بنانا، اشیاء کی تیاری کے لیے ملیں یا کارخانے قائم کرنا، جنگ کے لیے تلوار اور گھوڑے کی جگہ بندوقیں اور بم استعمال کرنا اور دین کی دعوت و تبلیغ یا اعلان کے لیے پہاڑی کی جگہ جدید ذرائع مثلاً ٹیلی ویژن یا ریڈیو کا استعمال کرنا- مولانا نے قرآنی منہاج کی تبدیلی کی یہی مثالیں دی ہیں، اگر منہاج اور طریق کار کی تبدیلی سے یہی چیزیں مراد ہیں تو پھر انہوں نے علما کی قید کیوں لگا دی، ان تبدیلیوں کو شرعی، سماجی اور اخلاقی طور پر کوئی شخص بھی حالات کے اعتبار سے اختیار کر سکتا ہے اور کرتا بھی ہے- ہاں! احکام شرعیہ کی تعمیل اور تنفیذ میں حالات اور ضرورت کے اعتبار سے جزوی ترمیم صرف علما ہی کرتے ہیں اور اسی مقصد کے لیے پوری دنیا میں مختلف فقہی مجلسیں بھی قائم کی گئی

ہیں-مولانا کے قلم سے غیر ارادی طور پر جو مذکورہ اقتباس نکلا ہے،اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا کے ذہن میں کہیں نہ کہیں منہاج سے مراد احکام شرعیہ ہی ہیں نہ کہ دعوت کے یہ زمانی ذرائع-

دراصل مولانا نے دین خداوندی کی تفہیم کے لیے اس کے صرف دو حصے کیے،ایک دین اور دوسرا منہاج،جبکہ انہیں تین حصے کرنا چاہیے تھا(۱) دین (یعنی تعلیمات الٰہی،عقیدہ اور اخلاق وغیرہ)(۲) منہاج (اوامر ونواہی پر مشتمل احکام شرعیہ)(۳) اور زمانی ذرائع- دو حصے کرنے کی وجہ سے منہاج اور زمانی ذرائع کا مفہوم آپس میں گڈمڈ ہو گیا اور انہوں نے زمانی ذرائع کو منہاج سمجھ لیا،یہی وہ بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے ان کی مفروضہ تشریحات کی ساری عمارت ٹیڑھی بن گئی اور اسی بنیادی غلطی نے انہیں اس مقام تک پہنچا دیا کہ وہ اپنی مفروضہ تشریح کو صاد کرنے کے لیے پیغمبر اسلام ﷺ کے ''اسوہ'' کو حسنہ اور کاملہ کے درمیان تقسیم کرتے ہوئے اس کی ''کاملیت'' کے ہی انکاری ہو گئے-

میرے نزدیک اسوۂ حسنہ کی کاملیت کا انکار دین اسلام کی کاملیت کا انکار ہے-یہ ایک معلوم تاریخی اور مذہبی حقیقت ہے کہ قرآنی آیت **لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ** (الاحزاب:۲۱) میں اسوہ سے مراد رسول اکرم ﷺ کا ''ایسا واجب التقلید منہاج ہے جس میں ان کے اقوال،افعال اور احوال تینوں شامل ہیں'' اور انہی تینوں کے مجموعہ کا نام ''حدیث رسول'' ہے،جو اسلام کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے جس پر نظریات اسلامی کی بنیاد قائم ہے اور حدیث رسول کی کاملیت کا انکار دراصل دین کی کاملیت کا واضح انکار ہے، کیونکہ اسوہ کے کمال کا انکار بدیہی طور پر یہی نتیجہ برآمد کرتا ہے-اسوۂ کا یہی مفہوم قرن اول سے آج تک تمام مستند مفسرین اور محدثین نے بھی بتایا ہے-تفسیر ابن کثیر میں زیر بحث آیت کے ذیل میں ہے: **ہذہ الآیۃ الکریمۃ اصل کبیر فی التأسی برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اقوالہ وافعالہ واحوالہ** ''یہ آیت کریمہ رسول کریم ﷺ کے اقوال،افعال اور احوال کی اقتدا میں ایک بڑی دلیل ہے''-اور آگے کی آیت نے تو رسول اکرم ﷺ کے اسوہ کے کامل ہونے کی نہایت مستحکم دلیل فراہم کردی ہے اور وہ آیت یہ

ہے:**لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیراً** حضور کا یہ اسوہ (منہاج) ان لوگوں کے لیے ہے''جو(قیامت تک) اللہ کی رضا اور آخرت کے تمنائی ہیں اور ذکر الٰہی میں خوب مشغول رہتے ہیں''-

رسول اکرم ﷺ کا طریق کار (Method) قیامت تک امت محمدیہ کے لیے فائنل ماڈل نہ ہو تو مذکورہ آیت کا واضح مطلوب سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہو جائے گا-پیغمبر اعظم ﷺ کے اسوہ کی اقتدا کا حکم صرف عہد رسالت کے لیے نہیں تھا کہ اس وقت جو اللہ کی رضا اور آخرت چاہتے ہیں وہ اقتدا کرلیں،بلکہ قیامت تک کے لیے عام ہے——مولانا نے ''الرسالہ'' شمارہ اکتوبر میں ہی ایک جگہ فرمایا ہے کہ:''اللہ تعالیٰ نے آپ کو انسان کامل بنا کر انسانی نسل پر اپنا سب سے بڑا احسان فرمایا ہے''(ص:۳)

مولانا کے اس تحریری تضاد کو میں سمجھنے سے قاصر ہوں،کوئی انسان اچھا یا برا کامل یا ناقص اپنے اقوال واعمال،افعال وکردار اور زہد وورع کی بنیاد پر ہوتا ہے،قرآن نے اسی مفہوم کی تشریح ''تقویٰ'' کے جامع لفظ سے کی ہے کہ **ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم** (بیشک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ محبوب وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے) جب پیغمبر اعظم کا اسوہ (اقوال،افعال اور احوال پر مشتمل منہاج) ہی کامل نہیں ہے تو پھر کس بنیاد پر انہیں ''انسان کامل'' کہا گیا ہے؟ اور انسان کامل بنا کر ''نسل انسانی پر سب سے بڑا احسان فرمانے'' کا سوائے اس کے اور کیا مطلب ہے کہ پیغمبر اعظم کے اقوال،افعال اور احوال قیامت تک کے لیے رہنما اصول ہیں جن پر چل کر ہی انسان فلاح ونجات پا سکتا ہے-

جماعت اسلامی سے اپنی علیحدگی اور مودودی لٹریچر کا رد کرنے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے مولانا نے لکھا تھا کہ:

> ''اس کی وجہ وہ مخصوص نزاکت ہے جو مولانا مودودی کے لٹریچر نے پیدا کردی ہے-اس لٹریچر کی غلطی،عام غلطیوں سے مختلف ہے،اس (لٹریچر) نے یہ نہیں کیا کہ دین عقیدہ وعمل جس کا نام ہے،اس میں کوئی کمی بیشی کی ہو،وہ سارے دین کو تسلیم کرتا ہے مگر اس مجموعہ کے مختلف اجزاء کی واقعی حیثیت اس کی تشریح

میں بدل گئی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اس سے متاثر اذہان بظاہر سب کچھ مانتے ہیں مگر اس ''سب کچھ'' کو وہ اس طرح نہیں مانتے جس طرح حقیقتاً انہیں ماننا چاہیے''۔(تعبیر کی غلطی، ص:۱۶)

آج تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، مولانا کا لٹریچر بھی آج اپنی انوکھی تشریحات کی بنیاد پر اسی مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جس مرحلے میں مودودی صاحب کے لٹریچر کو چالیس سال قبل مولانا نے محسوس کر کے قلم اٹھانا ضروری سمجھا تھا کہ ان سے متاثر اذہان کو اُن غلط تعبیرات سے آگاہ کرایا جائے جن سے دین مجروح اور کمزور ہو رہا ہے۔مختصر مضمون کی شکل میں میری یہ مختصر تحریر بھی اسی جذبے کا ردعمل ہے۔

❑❑❑

لفظوں کے خلاف جنگ

اگست ۲۰۰۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے ایک سمپوزیم بعنوان ''جنگ کے خلاف دو باتیں'' Words against war کا انعقاد کیا، یہ پروگرام جامعہ کے ایڈورڈ سعید ہال میں ہوا، جس میں کثیر تعداد میں دانشوران نے شرکت کی اور میڈیائی پروپیگنڈہ کے زیر اثر اسلامی دہشت گردی، مذہبی تشدد پسندی اور آزادی اظہار رائے کے ساتھ امریکی بربریت پر بھی اپنی اپنی رائے کا کھل کر اظہار کیا، مجھے یاد آتا ہے کہ ان میں جامعہ ملیہ کے شعبۂ تاریخ وثقافت کے ایک استاد بھی تھے جنہوں نے پروگرام میں لوگوں کو یہ کہہ کر چونکا دیا کہ اس سمپوزیم کا عنوان ہی غلط رکھا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ اگر ہم اپنے مسائل کا حل داخلی سطح پر خود کرنا چاہتے ہیں تو اس سمپوزیم کا عنوان ''جنگ کے خلاف دو باتیں'' نہیں بلکہ ''لفظوں کے خلاف جنگ'' War aginst words رکھنا چاہیے تھا۔

مذکورہ عنوان پر ان کا مختصر خطاب ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ تھا، جوں جوں عالمی سطح پر جدت پسند مسلمانوں اور مغربی نظریات کے مقلد ہندوستانی میڈیا کے ذریعے نظریات اسلامی کی خودساختہ توجیہ اور لفظوں کی غلط تعبیر Misinterpretation سامنے آتی گئیں، مسائل کی تشخیص کے سلسلے میں ان کی گہری نظر کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا—اس وقت دنیا میں اسلام کی دو حیثیتیں ہیں جو اس کو دیگر تمام مذاہب سے ممتاز کرتی ہیں، پہلی حیثیت یہ کہ نظریاتی سطح پر اپنے ظہور سے آج تک یہ اپنی اصل ہیئت میں موجود ہے جو سوسائٹی میں تعلق باللہ اور اس کے نتیجے میں الہیاتی نظام کی اقامت کا داعی ہے اور دوسری حیثیت یہ کہ آج تک اپنی اصل ہیئت میں باقی رہنے کی وجہ سے پیدائش سے موت تک ہر لمحہ

مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے اس کے اصول وضوابط، الہیاتی احکام وتعلیمات اور دستور وروایات موجود ہیں، جن میں سے اکثر اختیاری نہیں لازمی ہیں- میرے نزدیک اسلام کی پہلی حیثیت مغرب کے لادینی حکمرانوں، ملکوں اور میڈیا کے لیے ''چیلنج'' کی ہے، جو مطلق العنانیت، ظلم وعدوان، سرمایہ کاری، عریانیت، بے ایمانی اور امتیازی سلوک کا خاتمہ عملی سطح پر سوسائٹی میں نہیں صرف کاغذوں پر کرنا چاہتے ہیں- اور اسلام کی دوسری حیثیت آزاد فکر اور جدت پسند مسلمانوں کے لیے ''رکاوٹ'' کی ہے، جو اپنی تعیش پسند طبیعت اور نفسانی خواہشات سے مغلوب زندگی کو اسلام کے فریم ورک میں نہیں گزار سکتے -جس کے نتیجے میں پہلا طبقہ (لادینی حکمرانوں، ملکوں اور میڈیا کا) اسلامی احکام واصول پر مبنی دیے گئے علماء کی آراء اور فیصلوں کو ''تشدد پسندی'' یا ''کٹرپنتھی'' (Extremism) سے تعبیر کرتا ہے، اسلام کی بنیادی تعلیمات پر حملے اور پیغمبر اسلام کی ذات پر انگشت نمائی کو جائز ٹھہراتے ہوئے انہیں ''آزادی اظہار رائے'' (Freedom of Expression) کہتا ہے اور چند غیر ملکی مسلم تنظیموں کی ریاستی اور ذاتی مفاد میں کی گئی مسلح جدوجہد کو ''اسلامی دہشت گردی'' (Islamic Terrorism) سے موسوم کرتا ہے—اور دوسرا طبقہ (جدت پسند مسلمانوں کا) اسلامی تعلیمات، نظریات اور احکام کو تبدیل کر کے اسلام کی خود ساختہ تشریح کو ''اصلاح'' (Reformation) کا نام دیتا ہے-

میرے خیال میں مذکورہ دونوں طبقوں کا اسلام کے تئیں مقدمہ ایک نفسیاتی کیس کا ہے جو اپنی پرابلم کی عارضی تسکین کے لیے مندرجہ بالا لفظوں کے ذریعے اسلامی نظریات پر تنقید کو جواز فراہم کرتے ہیں اور اس کی خود ساختہ تشریح (Self-made Interpretation) کے ذریعے اسلامی نظریات میں تبدیلی اور اصلاح کے خواہاں ہیں- اس کا علاج اب میڈیائی پروپیگنڈے کے زیر اثر اسلام کی معذرت خواہانہ تفہیم سے نہیں بلکہ ان طبقے کی کمزوریوں کی وضاحت کے ساتھ مذکورہ لفظوں کی صحیح توجیہ وتعبیر سے ہی ممکن ہے-

تشدد پسندی Extremism کیا ہے: -مذہبی قوانین اور اس کی روایات وتعلیمات

پر سختی سے کار بند رہنے والوں کو آج مغربی ممالک اور میڈیائی افراد شدت پسند (Extremists) کہتے ہیں- حالانکہ یہ مذہب پسندوں کا قابل نفریں برا نام ہے جس کے ذریعے مذہب بیزار مغربی ممالک اور میڈیا دنیا میں مذہبیت کو ختم کر کے الحادی اور سیکولر ذہنیت کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں - چونکہ اپنی تمام تر روایات، قوانین، احکام اور نظریات کے ساتھ اگر کوئی مذہب دنیا میں اپنا وجود رکھتا ہے تو وہ اسلام ہے، اس لیے اس لفظ کے ذریعے دنیا کو وہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مذہب پسندی دراصل شدت پسندی ہے جو امن عامہ اور سیکولرزم کے لیے خطرہ کی علامت ہے، تاکہ اس پروپیگنڈہ کی ضرب براہ راست اسلامی نظریات اور مسلمانوں پر پڑے اور وہ مغربی فلسفے کی تعقلیت اور اخلاقیت سے نظریاتی اور عملی طور پر گریزاں نہ رہیں اور نتیجے میں ان کی مذہبی اسپرٹ آپ ہی آپ رفتہ رفتہ دم توڑ دے-

کسی نظریے پر سختی سے کار بند رہنا تشدد (Extremism) نہیں تصلب (Preservance) ہے، تشدد اور تصلب میں نمایاں فرق ہے جو اہل علم سے مخفی نہیں، کسی نظریے پر جمے رہنے کا غلط نام تشدد ہے اور صحیح نام تصلب، اس لیے علمی انداز میں ان دونوں لفظوں کو سمجھنے کے لیے ان کی تعریف یا تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ:

''کسی نظریہ یا اصول پر سختی سے اس طرح اصرار کرنا کہ اس سے معاشرے میں فساد یا اشتعال انگیزی ہو تشدد ہے اور کسی نظریہ پر سختی سے اس طرح عمل پیرا رہنا کہ اس سے سوسائٹی میں اجتماعی فساد اور اشتعال پیدا نہ ہو تصلب ہے''-

اگر تشدد اور تصلب کی اس علمی تعریف کو سامنے رکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مذہبی تعلیمات پر عمل پیرائی تشدد نہیں تصلب ہے، کیونکہ مذہبی تعلیمات ونظریات پر سختی سے عمل پیرا رہنے سے نہ سوسائٹی میں امن عامہ کو خطرہ لاحق ہوتا ہے اور نہ اشتعال برپا ہوتا ہے بلکہ تعلق باللہ اور خوف خدا اور آخرت کے نتیجے میں ہر اس اچھے کام کو انسان کرنا چاہتا ہے یا کرتا ہے جس سے ایک صحت مند اور صالح معاشرہ تشکیل پاتا ہے- اس کے برخلاف مذکورہ تعریف کے حوالے سے مغربی ممالک اور میڈیا کا رویہ سراسر تشدد پر مبنی ہے- مغربی ممالک

اور میڈیا کا مذہبی تصلب کو ذاتی ناپسندیدگی کی وجہ سے ختم کر کے سیکولرزم اور مغربی تہذیب کے قیام کا اس قدر بھوت سوار ہے کہ اسلام کی ہر اس تعلیم اور حکم پر اپنی تنقید روا رکھتا ہے جو مغربی تہذیب سے متصادم ہے۔مخلوط تعلیم،عورتوں کا مغربی تنگ و چست لباس،فیشن، بے پردگی اور فلم بینی اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں کیونکہ ان چیزوں سے سوسائٹی میں جرائم کا اضافہ ہوتا ہے اور عریانیت کو فروغ ملتا ہے جو ظاہر ہے انسانی سماج کے لیے اچھی چیز نہیں مگر میڈیا اسی تسلسل سے ان چیزوں کی حمایت اور فروغ میں نہ صرف یہ کہ لکھ رہا ہے بلکہ اسلامی تعلیمات پر کاربند رہنے والوں پر تشدد پسندی کا الزام بھی عائد کر رہا ہے۔ظاہر ہے کہ مغربی ممالک اور میڈیا کے اس مسلسل عمل سے دنیا کے کروڑوں مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کے نتیجے میں امن عامہ کو خطرہ بھی لاحق ہے۔میڈیا اگر اپنے مشن اور نظریہ میں متشدد نہیں ہوتا تو وہ دوطرفہ عیوب و محاسن پر تبصرہ کرتا،لیکن اسلامی تعلیمات کی خوبیوں اور حکمت عملیوں کو نظرانداز کر کے وہ مسلسل اسلام کو مغرب کے جدید فلسفہ کی عقلی اور اخلاقی کسوٹی پر اتارنے کے لیے مصر ہے۔یہ تشدد پسندی نہیں تو اور کیا ہے؟۔

خود پسندی کا مسئلہ:۔کسی بھی ازم (ism) سے نظریاتی اور عملی طور پر منسلک ہونے کے بعد اس کی تعلیمات کو تسلیم کرنا، اسی کے مطابق زندگی گزارنا اور اس کے نظریات کی تبلیغ کرنا اخلاقی طور پر واجب ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اپنی سوچ اور طبیعت کو اس کا تابع بنانا فرض۔اس میں کوئی عیب بھی نہیں ہے کہ یہ منسلک افراد کا ذاتی مسئلہ ہوتا ہے، جس کی آئینی طور پر ہر ملک آزادی بھی دیتا ہے۔کسی ازم سے وابستہ ہونے کے بعد اگر کوئی شخص اس کی تعلیمات اور احکام پر عمل نہیں کرتا تو اسے علمی زبان میں مداہنت یا منافقت کہتے ہیں۔

اسلام بھی ایک ازم (نظریہ) ہے، اس کی اپنی تعلیمات ہیں اور منصوص احکام و قوانین ہیں، اگر کوئی کلمۂ طیبہ کے ذریعے اسلام سے اپنا رشتہ استوار کر لیتا ہے تو پھر اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائے اور اپنی فکر، ذہن اور طبیعت کو اسی کے تابع کر لے، نہ یہ کہ اسلامی تعلیمات کو اپنے ذہن و فکر کی اطاعت پر مجبور کرے۔اسلام خود سپردگی کا تقاضا کرتا ہے، اگر کوئی اپنی آزاد طبیعت اور فکر کی بنیاد پر اس کا مطیع ہو کر رہنا نہیں چاہتا تو

شوق سے وہ اس سے اپنا رشتہ منقطع کر لے، ''دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے''، لیکن اگر وہ اسلام سے جڑا رہنا چاہتا ہے تو ہر حال میں اس کی اطاعت اسے قبول کرنی ہوگی۔

تقریب فہم کے لیے اس کی مثال ایک ''ملک'' (State) سے بھی دی جا سکتی ہے۔ آپ اگر کسی ملک کو بحیثیت وطن اپناتے ہیں اور اس ملک میں رہ کر اس سے اپنا قومی اور جذباتی رشتہ رکھنا چاہتے ہیں تو ہر حال میں اس کے داخلی قوانین اور احکام کو تسلیم کرتے ہوئے انہی کے مطابق اس ملک میں رہنا ہوگا۔یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنی سہولت اور مزاج کے پیش نظر ان احکام و قوانین میں جس طرح چاہیں ترمیم و تنسیخ کریں۔اگر آپ اس کے قوانین اور دستور کا احترام نہیں کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ ایک مجرم اور باغی کہلائیں گے اور جرم کی نوعیت کے حساب سے سزا کے مستحق بھی ہوں گے، کبھی اس سزا کی نوعیت قید و بند کی ہوتی ہے، کبھی پھانسی کی ہوتی ہے اور کبھی جرائم کی سنگینی اور خطرے کے تسلسل کی وجہ سے ملک بدر (Exile) کی بھی۔اگر کسی کی طبیعت کسی ملک کی آئینی حیثیت کو پسند نہیں کرتی تو وہ شوق سے اس ملک کو چھوڑ کر کہیں بھی بود و باش اختیار کر سکتا ہے، وہ اس ملک کے اصول و قوانین کو نہیں بدل سکتا۔

مذہب کا کیس بھی بالکل اسی نوعیت کا ہے، کوئی اگر اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اس کی تعلیمات و احکام بھی انہی کے لیے ہیں جو اس سے وابستہ ہیں، ناپسندیدگی کی صورت میں اس کے قوانین و تعلیمات کو چھیڑ چھاڑ کرنے کی اسے قطعاً اجازت نہیں ہوگی۔ہاں! اس بات کی ضرور اسے اجازت دی جائے گی کہ وہ جس ازم سے چاہے اپنا رشتہ جوڑ لے، بصورت دیگر وہ ایک مذہبی مجرم اور باغی ہے، اسلامی ریاست کی صورت میں دنیا میں ہی سزا کا مستحق ہے اور جمہوری ریاست (Secular State) کی صورت میں خدا کے ہاں جوابدہ تو ضرور ہے۔

اس مختصر سی وضاحت کے بعد مشرق و مغرب میں احوال اسلام سے باخبر رہنے والوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس تمہید کا رخ کس کی طرف ہے۔اس وقت پوری دنیا خصوصاً مغرب میں تجدد پسند مشرقی مسلم مرد و خواتین کا ایک ایسا طبقہ ہے جو اپنی آزاد طبیعت

کی وجہ سے مسلسل اسلامی تعلیمات و نظریات کی خود ساختہ تشریح بنام اصلاح (Reformation) اور تبدیلی (Change) کے عنوان سے کر رہا ہے اور مغربی ممالک اور اس کے ترجمان میڈیا تواتر کے ساتھ ایسے طبقے کو مالی، صحافتی اور قانونی تعاون دے کر ان کی پیٹھ تھپتھپا رہے ہیں- مذہبی تجدد پسندی میری نظر میں فی الواقع غلط نہیں لیکن ایسی جدت جو اسلام کے چودہ سو سالہ علمی، فکری اور نظریاتی سرمائے کو محرف کر کے شکوک و شبہات کے دائرے میں لے آئے، مذموم ہے- رہا عصری تقاضوں کے پیش نظر اسلام کی فرعی مسائل میں جزوی تبدیلی کا مسئلہ تو یہ اس کے اکسپرٹ (علماء) کا منصب ہے اور حق بھی جو اسلام کے بنیادی ماٰخذ قرآن واحادیث میں غور وفکر کر کے مسائل کی نوعیت سمجھیں اور ان کا حل تلاش کریں- اس منصب تک پہنچنے کے لیے مقدمہ کے طور پر تین چیزوں کا حصول لازم کی حیثیت رکھتا ہے، جن کے بغیر مذہبی حیثیت سے یہ منصب کسی شخص کو بھی نہیں دیا جا سکتا-

پہلی چیز یہ کہ ایک انسان زبان سے کلمہ پڑھنے کے بعد دل سے اپنا تعلق اللہ رب العزت اور اس کے رسول سے قائم کرے اور خوف خدا اور خوف آخرت اپنے دل میں رکھے، دوسری اس تعلق کے نتیجے میں اسلام کے بنیادی نظریات وتعلیمات پر ایمان لائے اور ان کو عملی زندگی میں برتنے کی کوشش کرے اور تیسری برسوں علوم دینیہ، تاریخ اسلامی اور عربی زبان کے حصول اور مشق وممارست میں زندگی گزارنے کے بعد وہ اتنی اہلیت پیدا کر لے کہ براہ راست اسلام کے بنیادی ماٰخذ سے مسائل کی نوعیت کو سمجھ کر ان کی تشریح کر سکے- جس طرح سائنسی مسائل کی گتھی سلجھانے کے لیے سائنس داں (Scientist) ہوتا ہے اور سائنس داں کے منصب تک پہنچنے کے کچھ لازمی تقاضے، انسانی بیماریوں کی تشخیص اور ان کے علاج کے لیے ڈاکٹر اور ڈاکٹر بننے کے کچھ لازمی تقاضے ہیں اسی طرح اسلامی مسائل کی تشخیص اور اس کے حل کے لیے علماء ہوتے ہیں اور علماء کے منصب تک پہنچنے کے کچھ واجبی تقاضے ہیں- جس طرح ان تقاضوں کی تکمیل کیے بغیر کسی لوہار کا سائنسی مسائل کی عقدہ کشائی کرنا یا کسی بڑھئی کا انسانی بیماریوں کا علاج اور آپریشن کرنا مضحکہ خیز اور بعید از

قیاس ہے، اسی طرح کسی سیاسی جرنلسٹ، سماجی کارکن یا ڈاکٹر کا اسلامی احکام کی تشریح و توجیہ کرنا اسلام کے ساتھ ایک بھونڈا مذاق ہے- افسوس! کہ یہ بھونڈا مذاق مسلسل اسلام کے ساتھ ہو رہا ہے، جس کا ایک حالیہ نمونہ ہم نے ۲۶/اگست ۲۰۰۷ء کے ٹائمس آف انڈیا میں دیکھا کہ کس طرح تشدد پسندی، اصلاح، تبدیلی اور آزادی اظہار رائے جیسے لفظوں کا غلط استعمال کر کے ان کی آڑ میں مادر پدر آزادی اور مغربی تہذیب کے تسلط کی راہیں ہموار کی جا رہی ہیں-

تین مجتہد خواتین جو اسلام سے نا آشنا ہیں:- یہ کہانی تین تجدد پسند خواتین اسریٰ نعمانی، ارشاد منجی اور وفا سلطان کی ہے جو اسلامی نظریات وتعلیمات میں ''اجتہاد'' کے ذریعے تبدیلی لانا چاہتی ہیں، کیونکہ بقول ان کے اسلام کا موجودہ نظریہ عورتوں کے حقوق اور ان کی آزادی کو سلب کر رہا ہے- اس کہانی کو تائیدی تبصرے کے ساتھ تفصیل سے مذکورہ انگریزی اخبار نے Fighting the Fanatics (مذہبی انتہا پسندوں کے خلاف جنگ) کے عنوان سے شائع کیا ہے- جبکہ ذیلی عنوان ہے Three women who despite death threats, are fighting for change (تین عورتیں جو موت کی دھمکی کے باوجود تبدیلی کے لیے لڑ رہی ہیں) واضح رہے کہ اس کہانی کے ساتھ ان کی تصویریں بھی اخبار میں چھپی ہیں، تینوں نے فیشن ایبل پینٹ شرٹ پہن رکھے ہیں اور تینوں کے ہیر اسٹائل یعنی بالوں کا طرز مردوں کی طرح Bob Cut ہے- اس کہانی کی پہلی خاتون اسریٰ نعمانی ہیں، جن کا مختصر تعارف یہ ہے کہ یہ ایک سیاسی جرنلسٹ ہیں، نکاح اور شوہر کے بغیر ایک بچے کی ماں ہیں اور سیاسی مسائل پر لکھتی رہی ہیں- اسلامی تعلیمات اور احکام میں تبدیلی لانے کا خیال ان کے دل میں اس وقت سے آیا جب ان کے قریبی عیسائی دوست اور ساتھی ڈینیل پرل Daniel Pearl کو پاکستان میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا، اسی وقت سے اس نے ارادہ کر لیا کہ اپنے مذہب کو تشدد پسندوں (علماء) سے بچانا ہے، وہ اس دوران مکہ گئی وہاں اس نے مردوں کے ساتھ نماز پڑھنے کی کوشش کی مگر اسے ناکامی ہوئی، وہاں سے لوٹنے کے بعد بھی امریکہ میں اس نے جب جب مسجد میں جا کر مردوں کے

ساتھ نماز پڑھنے کی کوشش کی، اسے پریشان کیا گیا- اس کے بعد اخبار لکھتا ہے کہ:

A founder of the Islamic feminist movement, Nomani has been fighting since 2003 for women to be allowed the right to enter mosques by the same entrance as men, pray alongside them and even lead prayers.

''اسلامی نسائی تحریک کی بانی، نعمانی ۲۰۰۳ء سے عورتوں کو مسجد میں داخل ہونے (اسی دروازے سے جہاں سے مرد داخل ہوتے ہیں) انہیں مردوں کے شانہ بشانہ نماز پڑھنے اور امامت کرنے کے حقوق دلانے کے لیے جنگ کررہی ہیں''-

اس تحریک کے فروغ کے لیے اس نے ایک کتاب بعنوان Standing Alone in Mecca (مکہ میں تنہا کھڑی) بھی لکھی اور آخر کار ۲۰۰۵ء میں اپنی دوست اور مذکورہ فاؤنڈیشن کی بانی رکن امینہ ودود کے ساتھ نیویارک کی ایک مسجد میں چند عورتوں اور مردوں پر مشتمل ایک اجتماع کی امامت بھی کی- اس امامت کے بعد پوری دنیا میں جس طرح اسریٰ نعمانی کو میڈیا کے ذریعے راتوں رات شہرت ملی اور مسلمانوں میں اشتعال برپا ہوا وہ سبھی کو معلوم ہے- تشدد یا انتہا پسندی یہی ہے-

اسلام سدفساد (فتنہ کو روکنے) کا داعی ہے، عہد رسالت سے آج تک ایسی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی جس میں عورتوں کو مردوں کی امامت کی اجازت دی گئی ہو، اس کی بنیادی حکمت یہی تھی کہ عورتوں کا احترام کیا جائے اور ان کے چہروں اور جسموں کو غلط نگاہی سے بچایا جائے، اللہ رب العزت نے عورتوں میں وہ فطری کشش رکھی ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے تمام تر تقوی کے باوجود بھی ان کی طرف مائل ہوسکتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اگر عورت امامت کرے گی یا مردوں کے شانہ بہ شانہ نماز پڑھے گی تو آوارہ ذہن کو بھٹکنے اور غلط سوچنے کا موقع ملے گا اور دل عبادت میں بھی اپنے رب کی طرف مائل نہیں ہوسکے گا- جبکہ عبادت نام ہے اللہ اور بندے کے درمیان ایک ایسے نفسیاتی اور روحانی تعلق کا جس میں بندہ اپنے رب کی بارگاہ میں مخصوص ارکان کے ذریعے اپنی عجز و نیازی اور بندگی و خواری کا

نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ اظہار کرتا ہے- اور مسجدوں میں عورتوں کی امامت اور وجود کے ساتھ عبادت کی مطلوبہ صفات کا اظہار اور ترکیز فطری طور پر ممکن نہیں-

اسی فتنے کے سد باب کے لیے اسلام نے عورتوں کی امامت اور مردوں کے ساتھ عبادت پر پابندی عائد کردی- اسی لیے اسلام نے غیر محرم عورت و مرد کو تنہائی میں ملنے سے بھی روکا ہے کہ ان کے بیچ ایک شیطان ہوتا ہے جو دست درازی اور زنا کی طرف مائل کرسکتا ہے، یہاں تک کہ سد فساد کے لیے ہی غیر محرم کے ساتھ حج کے مقدس سفر کے لیے بھی روکا گیا ہے-

میرا خیال ہے کہ یہ ممانعت عورت و مرد کے درمیان تفریق Discrimination اور حقوق سلبی (Deniel of rights) کا کیس نہیں ہے بلکہ حقوق کی ادائیگی اور حفاظت و احترام کا کیس ہے، عورت کا یہ حق ہے کہ اسے غلط نگاہی سے بچا کر حفاظت میں رکھا جائے، اگر ہم اسے یہ حق نہیں دیتے ہیں تو لازمی طور پر ہم ان کا احترام نہیں کررہے ہیں- اسلام نے عورتوں کو مردوں کی امامت اور مسجد میں مردوں کے ساتھ مخلوط عبادت سے اسی لیے روکا ہے کہ وہ نازک آبگینہ ہے جس کی حفاظت اور احترام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے- عورتوں کے لیے پردے کا حکم اور تنگ نیم عریاں لباس پہننے سے ممانعت کی بھی یہی حکمت ہے- دراصل یہ زاویۂ نگاہ اور مشاہدہ کی بات ہے اور اسریٰ نعمانی جس ماحول میں جس زاویے سے کھڑی ہوکر اسلامی احکام کا مشاہدہ کررہی ہیں وہاں سے وہ احکام ٹیڑھے (Bent) نظر آرہے ہیں، پوری طرح کھڑے ہوکر صحیح مقام سے اگر ان کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ سیدھے نظر آئیں گے-

اس کے علاوہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ اگر مساجد میں عورتوں کو امامت یا مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جائے تو آج پنج وقتہ نماز میں جس طرح اکثر مساجد ویران رہتی ہیں وہ مسجدیں صفوں سے بھری نظر آئیں گی- عورتوں کی طرف کشش Women Attraction کا یہ فطری اور نفسیاتی نتیجہ ہے کہ آج تجارت کے ہر شعبے Business Sector میں عورتوں کو ترجیح دی جارہی ہے اور خاص طور پر وہ شعبہ

جہاں نمائش کے ذریعے اشیاء Products کی خرید وفروخت مطلوب ہے وہاں جوان اور خوبصورت خواتین کو زیادہ رکھا جارہا ہے، حتی کہ بڑے شہروں میں پٹرول پمپ تک میں بھی خواتین کو رکھا جارہا ہے تا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ ان سے ہی اپنی مطلوبہ اشیاء خریدیں اور تجارت کو فروغ ہو- میرے نزدیک یہ عورتوں کا استحصال ہے نہ کہ آزادی-

اس کہانی کی دوسری خاتون ارشاد منجی ہیں، یہ کناڈا میں رہتی ہیں اور ہم جنس پرستی کے فروغ کی ایک سرگرم رکن (Gay Activist)، اسرائیل کی مداح اور ''اجتہاد'' کی پرزور حامی ہیں، اسی اجتہاد کے نتیجے میں ان کی نظر میں ہم جنس پرستی (Homosexuality) نہ صرف درست ہے بلکہ مذہبی سطح پر بھی اس کی ممانعت نہیں- اسلامی مسائل پر ان کی کتاب The Trouble with Islam Toady (اسلام کو درپیش موجودہ مشکلات) بھی آچکی ہے، جس میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ اسلام میں عورتوں کے ساتھ کم تر برتاؤ، یہود پر حملے، اجتہاد کے فقدان اور مسلم معاشرے میں آج (مذہبی سطح پر) تخلیقی سوچ کے فقدان پر گفتگو کی ہے- یہ بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے ایک اجتہاد پروجیکٹ تشکیل دیا ہے جس کے حسب ذیل مقاصد ہیں'' آزاد خیال مسلمانوں اور غیر مسلموں کا اتحاد کرنا، ہم جنس پرستی سے متعلق بحثیں منعقد کرنا، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان شادی کرنا اور اسلام میں عورتوں کے حقوق کی از سر نو تشکیل دینا''-

اجتہاد کا ایک نمونہ یہ ہے کہ انہوں نے ہم جنس پرستی کو ایک مقام پر قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کہتی ہیں:

I acknowledge that the Koran contains passages implying homosexuality cannot be tolerated.In addition to the verse that says, 'God makes excellent everything He creates,there are other verses that say, 'God creates whom He will' and nothing God creates is in vain.How do my critics reconcile those statements with their condemnation of homosexuals?"

''میں اعتراف کرتی ہوں کہ قرآن میں اس طرح کی آیتیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ہم جنس پرستی کو برداشت نہیں کیا جائے گا، اسی کے ساتھ اس میں ایک ایسی بھی آیت ہے جو کہتی ہے کہ اللہ جس چیز کی تخلیق کرتا ہے اعلی سطح کی کرتا ہے اور ایسی بھی آئتیں ہیں جو کہتی ہیں کہ اللہ کسی چیز کی بھی بے مقصد تخلیق نہیں کرتا، یہاں مجھ پر تنقید کرنے والے ان مذکورہ قرآنی آیتوں اور ہم جنس پرستی کے خلاف اپنے بیانات کے درمیان کس طرح مطابقت پیدا کریں گے''-

دوسرے لفظوں میں دراصل یہاں وہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ قرآن نے ہم جنسی پرستی کو غلط بتایا ہے، لیکن ایسی بھی تو آیتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی کو مقصد کے تحت پیدا کرتا ہے، ان کی اجتہادی نظر میں یہاں دونوں آیتوں کے درمیان تعارض (Contradiction) پیدا ہو گیا ہے، کیونکہ جب ہر شئی کو اللہ نے مقصد کے تحت پیدا کیا ہے تو اس کا ایک مقصد تمتع اور لذت کا حصول بھی ہو سکتا ہے، جس سے ہم جنس پرستی کا جواز نکل جاتا ہے- اس مہمل، مضحکہ خیز اور غیر علمی اجتہاد کا جواب میری نظر میں تو صرف ''خاموشی'' ہے، لیکن میں نے اسے یہاں صرف اس لیے ذکر کیا کہ قارئین دیکھ لیں کہ اس وقت پوری دنیا خصوصاً مغرب میں اسلام داخلی اور خارجی سطح پر کن وحشت ناک صورت حال سے دو چار ہے- میری نظر میں اس اجتہاد کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی کہے کہ قرآن میں ہے کہ مرد وعورت آدم کی اولاد ہیں اور قرآن میں یہ بھی ہے کہ وہ آپس میں جو محرم ہیں یعنی باپ بیٹی سے، ماں بیٹے سے اور بھائی بہن سے شادی نہیں کر سکتا- یہاں ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے، جب دنیا کے تمام مرد وعورت آدم کی اولاد ہیں تو باپ بیٹی سے ماں بیٹے سے اور بھائی بہن سے رشتہ ازدواج میں کیوں نہیں منسلک ہو سکتے؟

یہ صحیح ہے کہ اللہ نے ہر شئی کو مقصد کے تحت پیدا کیا ہے، لیکن یہ معلوم حقیقت ہے کہ مقصدیت عام نہیں ہے، انسانی جسم کے ہر عضو کو ایک خاص مقصد کے تحت مقصد کی مناسبت سے خاص ہیئت میں تخلیق کیا گیا ہے- تخلیق کے بعد اس کا استعمال اس خاص مقصد کے تحت

ہی کیا جائے گا ورنہ غیر فطری استعمال کی وجہ سے وہ برباد بھی ہوسکتا ہے اور اذیت ناک بھی۔ اللہ نے آنکھ کی تخلیق ایک خاص مقصد یعنی دیکھنے کے لیے کی ہے، اب اس مقصد کو عموم کر کے اس سے سننے کی بھی کوشش کی جائے تو اس غیر فطری عمل کا جواز تلاش کرنے سے میڈیکل سائنس بھی قاصر ہوگی۔

اس کہانی کی تیسری خاتون شام نژاد وفا سلطان ہیں جو برسوں سے امریکہ میں بحیثیت ماہر نفسیات(Psychiatrist) مقیم ہیں - ان کے بقول ۱۹۷۹ء میں شام کی یونیورسٹی الیپو (Aleppo) میں جب وہ تعلیم حاصل کر رہی تھیں، کسی بات پر مسلم انتہا پسندوں کے ایک گروپ نے ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے ایک پروفیسر کو گولی ماردی، اس عمل نے اسلام کے خلاف ان کے ذہن میں کئی سوالات جنم دیے اور آخر کار انہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا اور اب وہ اپنے آپ کو ''سیکولر'' کہلانا پسند کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام کے خلاف ان کے سوالات اور اعتراضات کو یہودیوں نے کافی سراہا اور ان کی آواز کو Voice of progressive muslims (ترقی پذیر مسلمانوں کی آواز) کہا۔

ان کو غیر معمولی شہرت اس وقت ملی جب ۲۱ رفروری ۲۰۰۶ء کو عرب کے معروف چینل الجزیرہ ٹیلی ویژن پر جامعہ ازہر مصر کے ڈاکٹر ابراہیم الخولی سے اسلام پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:

"The clash we are witnessing around the world is not a clash of religions or a clash of civilisations.It's a clash bwetween a mentality that belongs to the Middle Ages and another that belongs to the 21st century"

''آج دنیا میں جو تصادم ہم دیکھ رہے ہیں یہ مذہبوں اور تہذیبوں کا تصادم نہیں ہے، بلکہ یہ عہد وسطی اور اکیسویں صدی کی ذہنیت کا تصادم ہے''۔

دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ عہد وسطی کے اسلام اور اکیسویں صدی کے اسلام میں زمین وآسمان کا فرق ہونا چاہیے۔

اسلام کی بنیادی تعلیمات، نظریات اور احکام محفوظ اور غیر متبدل ہیں، اس میں

کسی بھی تبدیلی کی گنجائش نہیں، جس طرح بنام اسلام چند مسلمانوں کے انتہا پسندانہ عمل اور ان کے برے افعال کی توجیہ اسلامی تعلیمات سے نہیں کی جاسکتی اسی طرح انسانی تعقلیت اور طبیعت پر مبنی اسلام کی خود ساختہ تشریح بھی اسلامی نظریات سے نہیں کی جا سکتی۔ قرآن الہیاتی کتاب ہے، چودہ سو برس قبل ہی اس نے ایسے افراد کے تعلق سے مسلمانوں کو متنبہ کر دیا تھا:

''ہم نے تم کو دین کی اچھی راہ پر کیا ہے، تم اسی راہ پر چلو، اور نادانوں کی خواہشوں (دین کی خود ساختہ تعبیر) کا اتباع نہ کرو''۔ (جاثیہ/۱۸)

فی الواقع میرے نزدیک دونوں طبقوں (دہشت پسندانہ کاروائی کو اسلامی نظریات سے جواز فراہم کرنے والوں اور اپنے مزاج کے مطابق اسلام کی توضیح کرنے والوں) میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کے فکر وعمل سے دین مجروح ہو رہا ہے، پہلے نے اپنے عمل سے اسلام کی غلط شبیہ دنیا کے سامنے رکھ دی ہے اور دوسرے نے اپنی غلط فکر اور سوچ سے اسلام کی صورت بگاڑ دی ہے، اس لیے میرے خیال میں ایک عملی اور دوسرا فکری طور پر انتہا پسندی میں مبتلا ہے، جو کروڑوں مسلمانوں کے لیے اشتعال کا باعث ہے۔

اسلام کی ایک طالبہ کی رائے: ۔معروف نو مسلم امریکی دانشور خاتون مریم جمیلہ (مارگریٹ مارکس Margaret Marcus) امریکہ کے شہر نیویارک میں ۱۹۳۴ء میں مغربی تہذیب کے درمیان ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئیں، مگر مغربی تہذیب اور محرّف یہودی تعلیمات انہیں فطرت سے دور معلوم ہوئیں اور پھر انہوں نے مذاہب کا تقابلی مطالعہ شروع کیا اور آخر اسلامی تہذیب اور تعلیمات سے متاثر ہو کر نیویارک کے اسلامک مشن سینٹر میں ۲۴ رمئی ۱۹۶۱ء کو شیخ داؤد احمد فیصل کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہوئیں اور پھر پاکستان میں بود و باش اختیار کر لی۔ اس وقت وہ اسلامی نظریات کے حوالے سے کئی اہم کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں اپنے ایک مضمون میں ایسے ہی طبقے کی نفسیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا کہ:

''ایسے حضرات کی تحریریں مجھے اشتعال دلاتی ہیں اور چڑ چڑا کر دیتی ہیں، جو معذرت خواہانہ انداز میں اسلام کی ایک ایسی جدید تعبیر پیش کرتے ہیں جو مغرب کے فلسفہ جدید کے اخلاقی اور عقلی معیاروں سے لگا کھائیں اور اس شوق میں اسلام کے بنیادی اصولوں تک کو بدل دینے کی ہوس رکھتے ہیں تا کہ دنیاوی مصلحتوں کی خاطر اسلام کو رائج الوقت معیارات کے مطابق ڈھال دیا جائے''۔(میرا مطالعہ:ص:۴۱)

مذکورہ اقتباس ایک ایسی خاتون کا ہے جو مغربی ماحول میں پیدا ہونے اور برسوں رہنے کے بعد مذہب اور تہذیب کے تقابلی مطالعے کے نتیجے میں اسلام کو قبول کرتی ہے اور ساتھ ہی ایسے تجدد پسند مسلمانوں کی نفسیات تک بھی رسائی حاصل کر لیتی ہے جبکہ مذکورہ تینوں خواتین مسلم گھرانوں میں پیدا ہونے کے باوجود مغرب کے عقلی اخلاقی اور تہذیبی فلسفۂ جدید کی پیچیدگیوں میں گم ہو جاتی ہیں اور اس کے مطابق دین کو ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مغرب کے اسی فلسفہ جدید کا کرشمہ ہے کہ عیسائی مذہب نظریاتی طور پر بالکل محرف ہو کر رہ گیا ہے اور عملی طور پر عیسائی تعلیمات مغربی معاشرے سے رخصت ہو چکی ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور احکام انہی پر نافذ ہوتے ہیں جو اسلام سے وابستہ ہوتے ہیں، اس سے غیر وابستگی کی صورت میں وہ آزاد ہیں۔

دین کے قبول وعدم قبول کے سلسلے میں تو اسلام نے آزادی دی ہے لیکن وابستگی کے بعد اس کی من مانی توجیہ کی اجازت نہیں دی جائے گی، بلکہ اس کی اطاعت واجب ہوگی اور اسلامی مسائل کی عصری تفہیم وتشریح کی اجازت بھی انہی کو دی جائے گی (جیسا کہ پہلے بتایا گیا) کہ جو کم از کم مقدمہ کے طور پر مطلوبہ تین شرطوں کی تکمیل کر چکے ہوں۔ پھر ایسی صورت میں میڈیا اور خود ان مذکورہ خواتین کا یہ دعویٰ کہ وہ اسلام میں ''تبدیلی'' کے لیے کوشاں ہیں، عجیب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ تینوں خواتین نے خود نظریاتی اور عملی طور پر یہ بتا دیا ہے اور اس مزاج کا پورا طبقہ گاہے بگاہے اپنے فکر وعمل سے یہ بتاتا رہتا ہے کہ وہ اسلام سے وابستہ نہیں یا کم از کم اسلام کے مطلوبہ لازمی اور بنیادی شرطوں کی تکمیل سے قاصر ہے، ایسے

میں مفروضہ تبدیلی یا اصلاح کا دعوی بے بنیاد ہو جاتا ہے — کہ یہ تبدیلی یا اصلاح وہ لوگ کس کے لیے اور کس مقصد کے لیے لانا چاہتے ہیں۔

❑❑❑

اسلامی اقدار اور روایات کا غیر شعوری زوال

کیا آئندہ پچاس برسوں کے بعد مدارس اسلامیہ کو طلبہ میسر ہوں گے؟

اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ ''آئندہ پچاس برسوں کے بعد مدارس اسلامیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلبہ میسر نہیں ہوں گے'' تو شاید آپ مجھے قنوطیت کا طعنہ دیں گے اور عالمی سطح پر مسلمانوں کی موجودہ مذہبی ، سیاسی اور معاشی صورت حال سے یکسر چشم پوشی کرتے ہوئے یہ کہوں کہ ''ہندوستان میں مدارس کا مستقبل روشن و تابناک ہے'' تو عقیدت محضہ کی اس کارفرمائی پر میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا - دراصل سولہویں صدی میں عیسائیت کی تجدید یا یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی آڑ میں یہودیوں نے جو چالیں چلی ہیں اس کے نتیجے میں دین مسیحی کی صورت میں اگر کچھ باقی رہ گیا ہے تو وہ صرف اس کا نام ہے - اقوام عالم کی تاریخ کے واقف کار جانتے ہیں کہ یہودیوں نے دنیا پر حکومت کرنے کے جنون میں یورپ کے اندر ایسے جال بنے کہ عالم عیسائیت نے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے مذہب کا مدفن تیار کرلیا اور عیسائیت کی تنظیم اور تجدید کاری کے نام پر عریانیت ، جنسی انارکی اور مادیت کو گلے سے لگا لیا - یہ سچ ہے کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے، لیکن یہ تو ہمیں دیکھنا ہے کہ تاریخ کا یہ اعادہ ہمیں کس مقام پر لا کھڑا کیا ہے؟ پچھلے چند برسوں سے پوری دنیا میں میڈیا کے ذریعے اسلام کی تجدید و اصلاح کی جو آوازیں اٹھائی جارہی ہیں اور مغربی سیکولرزم ، مشرکانہ روحانیت ، معیشت ، تہذیب نو اور سیاست کی آڑ میں مسلمانوں کو اپنے اقدار ، تہذیب ، روایات اور مذہبی تصلب سے دست بردار کرنے کی جو تحریکیں چل رہی ہیں ، ہر لمحہ ان میں شدت آتی جارہی ہے - آج تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ مسلم

مفکرین کو اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ان بے ہنگم آوازوں کا زیر و بم اور ان تحریکوں کا نشیب و فراز بالکل وہی ہے جو سولہویں صدی میں کبھی عیسائیت کی تجدید و اصلاح کے نام پر تھا ، جس کا منطقی انجام دین مسیحی کے خاتمے کی شکل میں ہوا -

مدارس اسلامیہ دین کی تبلیغ کے مضبوط مراکز ہیں اور ان میں دینی تعلیم و تربیت پانے والے طلبہ مسلم سماج کے ہی افراد ، اگر دین کی تجدید و اصلاح کے پرفریب میں نعروں میں غیر شعوری طور پر مسلم سماج سے مذہبی روح کو ختم کردی جاتی ہے تو پھر ہمارا یہ جملہ قنوطیت کے دائرے سے نکل کر حقیقت کے ذیل میں آجاتا ہے کہ ''آئندہ پچاس برسوں کے بعد مدارس اسلامیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلبہ میسر نہیں ہوں گے'' - لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زندہ قوم نہ تو خوش فہمیوں کی جنت میں رہتی ہے اور نہ مایوسیوں اور محرومیوں سے گھبرا کر کنج نشیں ہوجاتی ہے - اہل اسلام کی تاریخ رہی ہے کہ انہوں نے ہمیشہ مایوسیوں کی شب تار سے امیدوں کا چراغ روشن کیا - آج ہمیں بھی پیش آمدہ سطور میں ان حالات و حقائق کا تجزیہ کر کے کسی با مقصد حل کی طرف پہنچنے کی کوشش کرنا ہے -

تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے: - کسی معاشرے کے ذہن و فکر سے کسی مذہب یا عقیدے کا خاتمہ دو طرح سے کیا جاتا ہے ، پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ اعلانیہ کسی مذہب یا تہذیب و روایات سے بلا واسطہ دست برداری کی تحریکیں چلائی جائیں - دوسرا مادیت ، فیشن اور تہذیب کے واسطے سے دین کا خاتمہ کیا جائے - پہلی صورت میں تصادم اور فساد یقینی ہے اور کامیابی کے امکانات بھی نہیں ہیں ، اس لیے اس کی اجازت نہ تو کوئی ملک دیتا ہے اور نہ ہی کوئی قانون ، جب کہ دوسری صورت میں نہ تو کوئی تصادم ہے اور نہ فساد کا اندیشہ اور کامیابی کے امکانات بھی سو فی صدی ہیں ، اگر کوئی معیشت ، فیشن ، سیکولرزم اور مغربی علوم کے حوالے سے غیر شعوری طور پر کسی کے مذہبی تصلب کو ختم کر رہا ہے تو دنیا کا کوئی بھی قانون اسے روکنے سے قاصر ہے - اس لیے مذہبی آزادی کے بنیادی حق کو چھیڑ چھاڑ کیے بغیر یہودیوں نے صدیوں پہلے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے نام پر دین مسیحی کے خاتمے کے لیے دوسری صورت کو اپنایا اور عیسائیوں کو غیر شعوری طور پر اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں انہیں

اپنے مذہب کی قربانی دینی ہی پڑی- اگر یہودیوں نے پہلی صورت کو اپنایا ہوتا تو شاید عیسائیوں سے براہ راست ٹکراؤ کے نتیجے میں انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا، اس لیے کہ ہر شخص کو اپنا مذہب، اپنی روایات اور اپنی تہذیب عزیز ہوتی ہے- آج اگر مسلمان اپنے مذہبی نظریات اور تہذیب وروایات کے تحفظ کے لیے مشرق ومغرب سے اٹھنے والی اس تحریک کا انتظار کر رہے ہیں جو اسلام سے دست برداری کا بلا واسطہ اعلان کرے گی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عیسائیوں کی عبرت ناک تاریخ سے اب تک ہم نے سبق حاصل نہیں کیا حالانکہ اسلام کی تجدید واصلاح کے نعروں میں مادیت، مغربی علوم، فیشن، سیکولرازم اور مشرکانہ روحانیت کے واسطے سے ہم اس مقام کی طرف گھسیٹے جا رہے ہیں جہاں ہمارے ہاتھوں میں اسلام کے نام پر صرف اس کا نام ہوگا-

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عیسائیت کی تجدید واصلاح کی تحریکیں خود عیسائیوں نے نہیں چلائی بلکہ ان تحریکوں کے اصل فکری مراکز یہودیوں کے مذہبی وروحانی سینٹرز ''یشیوا'' تھے، ان کے حقیقی عامل یہودی تجارتی کمپنیاں، میڈیا اور ان کے خفیہ مذہبی وروحانی ادارے- اور ان تحریکیوں کے مضبوط آلۂ کار عیسائیوں کے اباحیت پسند اور روشن خیال افراد- دین مسیحی کے خاتمے کے لیے اصلاح وتجدید کی تحریک میں اہل یہود نے سب سے پہلے عیسائی اباحیت پسندوں کو انفرادی آزادی Individual Freedom کے نام پر ورغلایا، جنھوں نے عیسائیت کے نئے مفاہیم اور معانی یورپ میں پیش کیے، پھر حکمراں طبقے کو باختیار ہونے کی ترغیب دی، چنانچہ مذہب کو فرد کا نجی معاملہ کہہ کر کلیسا کو سیاسی وانتظامی امور سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا، دوسری طرف نظریۂ توحید، رسالت، آخرت اور وحی جو کلیسا کا سرچشمۂ قوت تھا اسے کمزور کرنے کے لیے قدیم یونانی علوم، فلسفہ، ادب اور آرٹ کو عالم عیسائیت میں پھیلایا گیا تاکہ دین مسیحی اباحیت پسندی، جنسی انارکی، مادیت اور تہذیبی زوال سے دوچار ہو جائے، جسے ''ہیومنزم'' کا نام دیا گیا، اسی کو اب سیکولرازم سے تعبیر کیا جاتا ہے، جہاں انسان توحید، رسالت، آخرت، مذہب، بندگی اور اطاعت سے بے نیاز ہو کر انسانیت Humanism تعقلیت Rationlism اور روحانیت Sprituality کی

بات کرتا ہے- چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان تحریکوں کے زیر اثر پورے یورپ یا عالم عیسائیت میں اباحیت، عریانیت، جنسی فحاشی، عقائد سے بغاوت اور کلیسا کی مخالفت کا جو طوفان اٹھا ہے اس پر بندھ باندھنا اب کسی کے بوتے کا نہیں رہا-

عیسائیت کی تجدید اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی اس پوری تحریک پر نظر ڈالیے اور غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ تاریخ واقعی اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اور اب اس تحریک کا رخ اسلام کے خاتمے کی طرف ہے- آج بھی اس فکری تحریک کے اصل مراکز ''یشیوا'' ہی ہیں، اس کے حقیقی عامل تجارتی کمپنیاں، میڈیا اور ان کے مذہبی وروحانی ادارے اور اس تحریک کے آلہ کار مسلمانوں کے اباحیت پسند اور روشن خیال افراد- یشیوا کے اشارے پر یہودی تجارتی ملٹی نیشنل کمپنیاں، بینک اور قرض Loan کے بڑے ادارے مادیت اور صارفیت کے نام پر مسلمانوں کو اپنا معاشی غلام بنا رہے ہیں اور مسلم حکمراں اور ممالک عالمی بینکوں کے قرضوں میں سر سے پیر تک ڈوبے ہوئے ہیں اور میڈیا اسلامی نظریات وروایات پر حملے کر کے اسلام کی تجدید واصلاح کی آوازیں بلند کر رہا ہے، جن آوازوں کی صدائے بازگشت کا کام اباحیت پسند اور روشن ضمیر مسلمان کر رہے ہیں- اس تحریک کی شروعات کل بھی یہودیوں نے آزادرو اور تعقلیت پسند عیسائیوں سے کی تھی اور آج بھی اس کی شروعات وہیں سے ہی ہو رہی تاکہ داخلی سطح سے جب یہ آواز اٹھے تو تصادم کا اندیشہ کم اور کامیابی کی امید یقینی ہو- گزشتہ پچاس برسوں کی تاریخ ہمارے پیش نظر ہے اسلام کی تجدید واصلاح کا نعرہ خارجی سطح سے نہیں لگا بلکہ اس کی یورش اندرون خانہ سے اٹھی اور ایسے لوگوں کی نہ صرف پیٹھ تھپتھپائی گئی بلکہ انہیں اس یورش کے عوض سیکورٹی، مالی تعاون اور سیاسی پناہیں بھی دی گئیں- حمید دلوائی سے لے کر سلمان رشدی، تسلیمہ نسرین، عابد رضا بیدار، مشیر الحسن، شبانہ اعظمی، جاوید اختر، علی سردار جعفری، کریم چھاگلہ، طاہر محمود اور اے پی جے عبدالکلام تک ایک لمبی فہرست ہے جو مدارس کی نام نہاد تجدید، علماء کی ہجو، دینی علوم میں مغربی علوم کی شمولیت، اسلام کے بنیادی نظریات کا انکار، مشرکانہ روحانیت اور تحریک وحدت ادیان کی حمایت میں سرگرم ہیں، جن کی تحریری وزبانی تحریک پر اب مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ غیر

شعوری طور پر اباحیت پسندی، دین بیزاری اور مادیت مبتلا ہو چکا ہے۔

روحانیت اسلامی افکار کا سرچشمۂ قوت ہے، اس قوت سے اسلام سمتوں میں پھیلا، جو تزکیۂ نفس اور تطہیر قلب کے ذریعے خدائے واحد کی بندگی اور اطاعت کی ترغیب دیتا ہے اور حدود اللہ کو قائم رکھنے پر اصرار کرتا ہے، مگر یہودی تجدیدی تحریک نے یورپ میں اپنے روحانی اداروں سے روحانیت کا جو نیا پیراہن تیار کیا ہے اس میں نہ نفس کی خواہشات چھپتی ہے، نہ قلب کی شرانگیزی ڈھکتی ہے اور نہ عقل بد اندیش کے باغیانہ تیور روپوش ہوتے ہیں، ہاں! روحانیت کے اس نیم عریاں لباس میں اگر دل و نگاہ سے کچھ اوجھل ہوتا ہے تو وہ ہے خدائے واحد کی بندگی اور اطاعت۔ مسلمانوں کی کم نصیبی ہے کہ اس تجدیدی تحریک نے ایسے مضحکہ خیز اور مشرکانہ روحانیت کی زمام کچھ مسلم باباؤں کے ہاتھوں میں بھی دے دی ہے، جنہیں غیر مسلموں کی طرح روحانیت کے جلوے کبھی رجنیش کے آشرم میں نظر آتے ہیں تو کبھی موسیقیت کے قحبہ خانوں میں، کبھی بابا رام دیو کے یوگا آسن میں دکھائی دیتے ہیں تو کبھی رشی منیوں کے دھرم شالاؤں اور وحدت ادیان کی تحریکوں میں ـــــ غالباً تصوف کے تحریف شدہ ثانوی مآخذ اور روحانیت کے اسی یہودی مفہوم کے زیر اثر ہی بہت سے مفکرین نے تصوف کو اسلامی فکر کے منافی قرار دیتے ہوئے کبھی اسے رہبانیت کا منبع قرار دیا تو کبھی اسے افیون کہا جو زندگی سے گریز کی تعلیم دیتا ہے، تو کبھی سفسطہ جو عقل و حواس کو پرانی شراب کی طرح مختل کر دیتا ہے۔ یہاں اسلام کی تجدید و اصلاح کی تحریک نے ایک تیر سے دو شکار کیے، ایک طرف تو مسلمانوں میں ایسے طبقے کو پیدا کر دیا جو سرے سے اسلام کی اس فکری قوت کا انکاری ہو گیا اور دوسری طرف جن لوگوں نے روحانیت کو تسلیم کیا ان کے ہاتھوں میں روحانیت کی شکل میں ایسے عناصر دے دیے جن سے اسلام کے بنیادی عقائد اور اس کی روح پر ضرب پڑتی ہو۔

اسلامی قدروں کا غیر شعوری زوال: ۔ کہتے ہیں کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دوران مغربی علوم کی وسعت اور سائنس و ٹیکنالوجی کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے آج دنیا ایک عالمی گاؤں Global Village میں تبدیل ہو گئی ہے، جس کے ذریعے اقوام عالم علمی، معاشی

اور سیاسی حیثیت سے بے پناہ ترقی کر رہے ہیں، لیکن غور کریں تو اس ترقی نے اسلام اور اس کی آفاقی قدروں کو بری طرح پامال کیا ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اس ترقی نے طرح طرح کے آلے Instruments ایجاد کر کے دنیا کے فاصلوں کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے، جن سے انسانوں کو بے پناہ سہولتیں حاصل ہو رہی ہیں، انسان معاشی اور علمی سطح پر ترقی کر رہا ہے، مہینوں کے کام دنوں اور دنوں کے کام گھنٹوں اور منٹوں میں انجام پا رہے ہیں، لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ اس سائنسی ترقی نے آج انسانوں کو اس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ایک طرف کھائی ہے تو دوسری طرف سمندر، پہلے کا انتخاب مادی ترقی سے منہ موڑ کر گمنام موت کی گہرائی میں لے جاتا ہے اور دوسرے کا انتخاب مذہبی قدروں کی قربانی چاہتا ہے۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے مادیت کی جو آگ لگائی تھی اس کی لپٹیں انسانی ذہن و فکر کو اتنا گرما چکی ہیں کہ اب مادیت کی ہوس کو سرد کرنے کے لیے سمندر کی غواصی ان کی مجبوری بن جاتی ہے۔ اس کو چند مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

جب تک انفارمیشن ٹیکنالوجی اور سائنس نے بہت زیادہ ترقی نہیں کی تھی، مسلم معاشرہ اپنی مذہبی قدروں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھا، اسلامی عبادات اور ضروریات دین کی پاسداری کے ساتھ پردے کا اہتمام، تہذیب و شرافت، چھوٹے بڑوں کا ادب، شرم و حیا، اخلاق و رواداری اور دیگر سماجی اچھائیاں اس کی خاص علامتیں تھیں، مگر جوں جوں سائنس اور انفارمیشن ٹیکنالوجی ترقی کرتی رہی مسلم معاشرے سے مذہبی قدریں غیر محسوس طریقے سے رخصت ہوتی گئیں، آج جو مسلم معاشرہ ہے وہ مغربی اقدار کا حامل بھی ہے اور حامی بھی۔

انفارمیشن اور سائنسی ٹیکنالوجی کی اس ترقی نے ہمارے گھروں کو ٹیلی ویژن، کیمرے، موبائل، فون، لیپ ٹاپ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کیا دیے، ان کے ساتھ دبے قدموں سے مغربی تہذیب، فیشن، بے پردگی، بے حیائی، عریانیت اور مادیت بھی داخل ہو گئی۔ مسلم معاشرہ اگر اپنی پچاس سال قبل کی زندگی پر نظر ڈالے تو اس کو یہ ادراک آسانی سے ہو جائے

گا کہ کل تک جہاں علم دین حاصل کرنا فرض کی حیثیت رکھتا تھا، آج ان کے گھروں میں مادیت کی ایسی آندھی چل رہی ہے کہ دین کے بنیادی مسائل جاننے والا کوئی نہیں، کل تک ضروریات دین کی پاسداری فرض سمجھی جاتی تھی، آج نہ تو نمازوں اور روزوں کا وہ اہتمام ہے، نہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی کوئی اہمیت، کل تک علماء کی قدر ومنزلت کا حال یہ تھا کہ لوگ پلکوں پر بٹھایا کرتے تھے آج لوگ انہیں قدموں پر جگہ دینے کو تیار نہیں ہیں- مسلم خواتین کے پردے کا یہ عالم تھا کہ بازار تو دور کی بات ہے گھر کی ڈیوڑھی پر قدم رکھتے ہوئے وہ سو بار سوچتی تھیں آج حالات نے مسلم معاشرے کو وہاں لا کھڑا کیا ہے کہ اب عام مسلم گھرانوں کی بات تو الگ رہی جن گھرانوں سے اسلامی نظریات کا فروغ ہوا وہاں کی عورتیں بھی اب اپنے قدموں کو صارفیت کے بازاروں کی طرف اٹھنے سے نہیں روک پا رہی ہیں-

جب تک ٹیلی ویژن یا کمپیوٹر نہیں تھے، لاکھوں گھر فلم بینی، تہذیب نو کی عریانیت اور مادیت کی ہوس سے واقف نہیں تھے، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ گھروں میں کیا گئے مردوں کے ساتھ خواتین اور بچوں کے دلوں میں بھی ویسی ہی طرز رہائش، لباس اور روپے پیسے کے حصول کی تمنا کروٹیں لینے لگیں- آخر آپ کب تک انہیں ان کے حصول سے روک پائیں گے، گھر کے سربراہ اور بڑوں نے اگر اپنی زندگی میں انہیں روک بھی لیا تو ان کے بعد پھر انہیں کون روک پائے گا؟— موبائل آج زندگی کی ایسی ضرورت بن گیا ہے کہ اس کے بغیر زندگی مفلوج سی معلوم ہوتی ہے، اب اپنے ماضی کا جائزہ لیجیے کہ کل ہمارے گھروں میں فون نہیں تھے اور جن گھروں میں تھے وہاں غلطی سے بھی خواتین کو فون اٹھانے کی اجازت نہیں تھی، اگر گھر میں کوئی مرد نہ ہوا اور فون آ جائے تو گھنٹی بجتے بجتے ختم ہو جاتی مگر خواتین کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ وہ غیر محرم سے باتیں کریں، مگر آج فون تو ایک طرف گھر کی اکثر خواتین یہاں تک کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے پاس اپنے موبائل ہیں، وہ کس سے بات کر رہے ہیں اور ان پر کیا کر رہے ہیں؟ گھر کی چہار دیواری میں والدین کو بھی نہیں معلوم- آپ اپنے گھروں میں ٹیلی ویژن اس لیے لائے کہ اس پر نیوز سنیں گے اور اسلامی چینل دیکھیں گے، لیکن آپ کے پیچھے اس ٹیلی ویژن پر آپ کے بچے فلمیں دیکھ رہے ہیں، آپ انہیں کیسے

روک پائیں گے؟ آپ نے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ اپنی ضروریات کے لیے لیا، لیکن گھر کے دوسرے افراد اس کمپیوٹر پر اگر گانے سن رہے ہیں فلمیں دیکھ رہے، انٹرنیٹ پر ہزاروں ہزار فحش اور جنسی اختلاط پر مشتمل ویب سائٹس کو لاگ آن کر رہے ہیں، آپ انہیں کیسے روک پائیں گے؟

اسلامی قدروں کا یہ زوال غیر شعوری ہے، سائنس وٹیکنالوجی کی ایجادات میں خیر وشر کے دونوں پہلو موجود ہیں اور ان اشیاء کا استعمال اب انسان کی مجبوری بن گئی ہے، ان سے نہ زاہد تنگ نظر محفوظ ہے اور نہ عابد شب زندہ دار، نہ پیر مغاں محفوظ ہے اور نہ واعظ شیریں مقال، عام مسلمانوں کی بات تو الگ رہی- اس طوفان پر بندش لگانا پوری دنیا میں اب کسی کے بس کا روگ نہیں رہا-

ایک تاریخی غلطی:- خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد بیسویں صدی کے ربع اول میں مسلم جدیدیت اور اسلام کی تجدید واصلاح کی تحریکوں کا آغاز ہوتا ہے، چونکہ مسلمان اپنی قوت، طاقت اور حاکمیت سے محروم کر دیے گئے، لہٰذا عروج کے لیے مغربی علوم، سائنس و ٹیکنالوجی اور مغربی آدرش اباحیت پسند مسلم تجزیہ نگار اور احیائی تحریکوں کے اصل اہداف ٹھہرے- ان اباحیت پسندوں کا خیال ہے کہ مسلمان مغربی علوم وفنون اور سائنس وٹیکنا لوجی میں مغرب سے پیچھے رہ گئے، لہٰذا زوال ان کا مقدر ہو گیا ہے اور مغرب نے ان علوم اور سائنس میں مہارت کی وجہ سے غلبہ حاصل کر لیا- مسلمانوں کے زوال کے تعلق سے پچھلے دو سو برسوں کا متفقہ تجزیہ یہی ہے کہ جدید علوم اور سائنس وٹیکنالوجی کے ذریعے ہی مسلمان غلبہ حاصل کر پائیں گے، اس کے سوا کامرانی کی اور کوئی صورت نہیں، حالانکہ یہ تجزیہ خالصتاً مرعوبیت، مغلوبیت اور غلامانہ فکر کا آئینہ دار ہے، حیرت ہے کہ اس طرز فکر کے دھارے میں بڑے بڑے مفکرین، علماء یہاں تک کہ امت کے حکیم علامہ اقبال بھی بہہ گئے- عروج و زوال کی تشخیص کے تجزیے میں نہ دعوت دین کا کوئی ذکر ہے اور نہ تبلیغ اسلام کی کوئی سوچ- حالات تو یہ بتا رہے ہیں کہ مسلم معاشرہ صرف یورپ کی سائنسی ایجادات کے زیر اثر اپنے عقائد، مذہبی نظریات اور تہذیبی قدروں سے ہاتھ دھو رہا ہے، جس دن یورپ کو کلیۃ

اپنا آدرش بنالیا، مذہبی، اخلاقی اور روحانی طور پر مغرب سے بدتر ہو جائے گا-

مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ انہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے دنیا پر نہ کبھی حکمرانی کی اور نہ ہی زمین کی وسعتوں میں اپنی کامرانی کے پرچم لہرائے- تاریخی حقائق ہمارے سامنے ہیں، مسلمانوں نے اندلس میں زبردست مادی ترقی حاصل کر لی لیکن مذہبی اور دعوتی سطح پر غیر مسلموں کو متاثر نہ کر سکے لہٰذا ہمیشہ وہ اقلیت میں رہے اور یورپ میں اسلام ترقی نہ کر سکا- خلافت عثمانیہ اور مغلیہ سلطنتیں مادی طور پر مستحکم رہیں، ان دونوں نے لاکھوں مربع میل میں پھیلی زمینوں کو مسخر کر لیا مگر دعوتی سطح پر دلوں کو مسخر نہ کر سکے، نتیجے میں سقوط دونوں کا مقدر ٹھہرا- خلافت عباسیہ کو اباحیت پسند مؤرخین اسلام کے عروج کا عہد زریں مانتے ہیں، کیونکہ وہ منگولوں اور تاتاریوں سے سائنس وٹیکنالوجی اور علوم وفنون میں برتر تھی اور تہذیب میں ان کا کوئی مقابلہ نہ تھا، لیکن مؤرخین اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ تہذیبی، مادی اور سائنسی برتری کے باوجود وہ تاتاری وحشیوں سے مات کیوں کھا گئی؟ مغربی غلامی میں گرفتار مورخین اپنے تجزیوں میں یہ بتانے سے بھی قاصر ہیں کہ شکست خوردہ اسلامی تہذیب صرف پچاس برسوں میں مادی اور سائنسی ترقی کے بغیر دوبارہ کیسے غالب آ گئی؟ آخر وہ کون سا علم، سائنس یا ٹیکنالوجی تھی جس نے چنگیز کے پوتے برکے کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا اور قوت وحکمرانی کا توازن آناً فاناً میں تبدیل ہو گیا- ان تاریخی تجزیوں میں اس سوال کا جواب بھی ہمیں نہیں ملتا کہ کیوں ترکوں کا سیلاب اپنی تمام تر مادی اور سائنسی برتری کے باوجود ویانا میں داخل نہ ہو سکا جب کہ یورپی حکمران مادی اور سائنسی قوت میں ان کے آس پاس نہیں نظر آتے تھے؟ آج ترکی، ملیشیا، مصر اور کویت نے مغربی تہذیب اختیار کر لی ہے آخر وہاں کون سے انقلاب برپا ہو گئے؟

عالم اسلام کے جدت پسند مفکرین نے مغربی تہذیب، مغربی فلسفے اور مغرب کی سائنسی ترقیات سے مغلوب ہو کر اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کا جو تصور دیا وہ محض مادیت پر مبنی تھا جس میں مذہب اور روحانیت کی کوئی جگہ نہیں تھی، گویا یہ تجزیہ امت سے سمٹ کر قومیت کے دائرے میں آ گیا کہ ایک قوم مادیت میں ترقی کر کے دوسری قوم پر بالا دستی

حاصل کر لے، اگر اس تجزیے میں مذہب اور روحانیت کا تصور ہوتا تو یہ تجزیہ امت کی تشکیل پر اصرار کرتا جہاں دعوت کے مطالبے ہوتے، قلوب کو تسخیر کرنے کا ایمانی فارمولہ ہوتا، اسلام کی تہذیبی قدروں کو بحال کرنے کی آوازیں ہوتیں کہ اسلام کی انہی قدروں سے مسلمانوں نے دنیا پر حکومت کی، جب یہ چیزیں ان سے رخصت ہوئیں محکومیت اور مغلوبیت ان کا مقدر ہو گئی-

غور کرنے کی بات:- ان حالات میں یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مسلم جدیدیت کی تحریک کے بطن سے پیدا ہونے والے مادیت کے جراثیم میں اسلامی قدروں کو غیر شعوری طور پر جو زوال بخشا ہے، اگر مدارس اور علما کا وجود نہ ہوتا تو قیافہ شناسوں کا یہ اندازہ غلط نہیں ہے کہ ہندوستان میں عیسائیت ہی کی طرح اسلام کا بھی صرف نام ہی باقی رہ جاتا اور دینی مراکز (مدارس) بھی یورپ کے کلیساؤں کی طرح یکے بعد دیگرے بند ہونے لگتے، لیکن علما کا معاشرہ کے بچوں کو دینی علوم سے آراستہ کرنے کی جدوجہد، مذہبی مسائل کی گتھیوں کو حل کرنے کی لگن، اسلامی علوم وفنون کو ترتیب دے کر انہیں سماج کے افراد تک پہنچانے کی فکر، دین ومذہب کی امامت وقیادت کرنے کی سوچ، مذہبی اجلاس کا انعقاد کر کے سماج میں دینی شعور بیدار کرنے کی تگ ودو اور دینی مراکز کو زندہ رکھنے کے جنون نے ہی آج بھی سماج کے مردہ دلوں میں دین کو زندہ کر رکھا ہے ـــــ لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ دین ومذہب کا یہ کارواں کب تک اسی خروش کے ساتھ چلتا رہے گا؟ علما سوسائٹی کا ہی ایک حصہ ہیں اس لیے مادیت ان کے دروازوں پر بھی دستک دے رہی ہے- مالداروں اور سرمایہ داروں کے بچوں کا مدارس میں عموماً داخل نہ ہونا، باصلاحیت افراد کا بے مقصد جلسوں کی طرف مائل ہونا، علما کا دینی سرگرمیوں کو ترک کر کے تجارت کی طرف جھکاؤ ہونا، ناموافق حالات میں کمیشن کے لیے چندے کرنا، خوشحال زندگی کی تمنا میں طلبہ کا فراغت کے بعد چھوٹی موٹی کمپنیوں میں نوکری کرنا اور اکثر علما کا اپنے بچوں کو عالم دین نہ بنانا مادی اور اقتصادی مجبوریوں کے روشن استعارے ہیں- کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ مدارس کی تدریس، تعلیم، مسجدوں کی امامت یا دینی مسائل پر تصنیف وتالیف کا کام خوش حال زندگی اور تابناک

مستقبل کی ضمانت نہیں دے سکتا - مدارس کو موڈرنائز کرنے، حکومتوں کے ماتحت کرنے، دین کے بنیادی مآخذ میں حذف و اضافہ کرنے کا شور اور علما کو مذہبی تصلب سے دست برداری کے نعرے ان پر مستزاد — ایسے میں سماج سے دینی پاسداری کی توقع اور علما سے توکل وقناعت کی اپیل حالات اور وقت سے بغاوت کہلائے گی، ان نازک حالات میں اب ہمیں نہایت سنجیدگی سے یہ سوچنا ہے کہ مادیت کی ان سرکش لہروں پر دینی مراکز کو قائم اور علما کو مستحکم کیسے رکھنا ہے، تاکہ دین کا یہ کارواں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے- مادیت کی لہروں سے جب سماج کا کوئی طبقہ محفوظ نہیں اور ہندوستان میں دینی خدمات ہمیں خوش حال زندگی کی ضمانت بھی نہیں دے سکتی تو پھر ہمارا یہ خدشہ غلط نہیں ہے کہ ''آئندہ پچاس برسوں کے بعد مدارس اسلامیہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلبہ میسر نہیں ہوں گے''-



علمائے دین کا معاشی استحکام

عصر حاضر میں مادی سیلاب سے پیدا شدہ دینی مشکلات کا واحد حل

خلافت عثمانیہ کے زوال (۱۹۲۴ء) کے بعد اسلام کی تجدید واصلاح کی جو تحریک چلائی گئی ہے اس کے تمام ذرائع صرف مادیت Materialism پر اصرار کرتے ہیں، مادیت کے ان تھپیڑوں سے دنیا کا کوئی بھی طبقہ اپنی کشتی کو صاف بچا کر نہیں نکال سکا، علماء کا شجرۂ نسب بھی چونکہ فرشتوں سے نہیں ملتا اس لیے ان کے دلوں میں بھی آسائشوں کی تمناؤں کا انگڑائی لینا فطری ہے، اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ علماء کے علمی و عملی زوال کے ہزار شکوے اور فکری افلاس کے ہزار طعنوں کے باوجود امت مسلمہ میں اگر دین کسی نہ کسی صورت میں زندہ ہے تو وہ انہی کی جہد مسلسل کا رہین منت ہے-

مؤرخین ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ تنظیم وترتیب کے فقدان اور نتائج سے چشم پوشی کو مانتے ہیں، میرا خیال ہے کہ بغاوت کے حوالے سے مؤرخین کے اس نفسیاتی مطالعے کا حاصل زندگی کے ہر شعبے اور ہر تحریک میں دیکھا جانا چاہیے- افسوس کہ آج کے اس آباد خرابے میں ہمارے علماء کی تمام تر توجہات صرف اور صرف مدارس کے قیام اور ان کی توسیع کی طرف ہے اور اس قیام وتوسیع کے جنون میں مدارس کے تابناک مستقبل کی فکر کہیں چھپ سی گئی ہے، حالانکہ انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جب دین کو زندہ رکھنے کا سارا کریڈٹ انہی کو جاتا ہے تو پھر مسلم بچوں کی دینی علوم اور مدارس سے بیزاری کی صورت میں ملت اسلامیہ ہند کے مرگ مفاجات کی تنہا ذمہ داری بھی انہیں قبول کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے-

کسی بھی تحریک یا ادارے پر اچانک زوال نہیں آتا بلکہ عروج وزوال دونوں کا سلسلہ عہد بہ عہد ہوتا ہے، آج ارباب مدارس ملکی سطح پر سیکڑوں مدارس اوران میں پڑھنے والے ہزاروں طلبہ کی تعداد دیکھ کران کے مستقبل کی طرف سے خوش فہمیوں کی جنت میں سیر کر رہے ہیں تو ان کی یہ سطحی نظر بجائے خود ہمارے مدارس کے زوال کا روشن استعارہ ہے- مدارس کی داخلی سرگرمیوں اوران کی تنظیم کے تعلق سے کوئی شخص اگرغور وفکر کرے تو ایسے بہت سے سوالات اس کے ذہن میں ابھریں گے جو مدارس کے مستقبل کے تعلق سے یقیناً اسے فکر مند کردیں گے-غور وفکر کے بعد میری بھی حالت اس نا معلوم شخص سے الگ نہیں، مدارس کی سرگرمیوں کا گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد جوسوالات سامنے آئے وہ یہ ہیں:

کچھ سوالات:- ● میرا خیال ہے کہ کسی بھی علاقے میں دینی ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہاں مقامی سطح پر اسلام کا فروغ ہواور مقامی افراد دین سے واقف ہو کر اسے اپنی عملی زندگی میں اپلائی Apply کرسکیں-لیکن ملک گیر سطح پر جس شہر، قصبہ یا دیہات میں جوادارہ ہے وہاں کے مقامی بچے دو فی صد بھی اس ادارے میں نہیں پڑھتے، مثال کے طور پر بہار کے شہر پٹنہ میں اگرکوئی ادارہ ہے تواس میں پڑھنے والے یا تو دوسرے صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر بہار کے کسی دورافتادہ دیہات سے، اسی طرح یوپی میں لکھنؤ کے اندراگرکوئی ادارہ ہے تو وہاں پڑھنے والے بچوں کی اکثریت یا تو بہار، بنگال، اڑیسہ اور دوسرے صوبوں کی ہے یا پھر یوپی کے دوسرے اضلاع کی، یہی حال ہندوستان کے تقریباً تمام مدارس کا ہے-اس سلسلے میں ارباب مدارس کے خلوص اورنیتوں پر مجھے شک نہیں، وہ اپنی بساط بھراس بات کی کوشش بھی کرتے ہوں گے کہ علاقائی بچے وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئیں، میں سمجھتا ہوں کہ انہی کوششوں کا ایک حصہ سالانہ جلسہ دُستار بندی کا انعقاد بھی ہے، تا کہ دستار بندی کے حسین منظرکو دیکھ کرمقامی والدین کے دلوں میں بھی اپنے بچوں کوعالم دین بنانے کی تمنا موجیں مارے، لیکن اس رونمائی کے باوجود وہ اپنی گاڑھی کمائی سے مدرسے کو چندہ دینے کوتو تیار ہیں، اپنے جگر گوشوں کو مدرسے میں داخل کرنے کے لیے راضی نہیں، آخر کیوں؟ - علاقائی سطح پر اگر علماء تیار ہوتے تو یقیناً وہاں کے

حالات میں دینی حیثیت سے نمایاں تبدیلیاں آتیں، لیکن دینی مرکز کھل جانے کے باوجود علاقائی افراد بے فیض ہیں، اب ایسے میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ مقامی سطح پر دینی مرکز کے بنیادی مقصد کے فقدان کی صورت میں اس ادارے کے قائم رہنے کا جواز کیا رہ جاتا ہے؟

● ماضی میں مدارس کے حالات کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والوں میں مقامی طلبہ بھی کثرت سے ہوتے تھے اوران طلبہ میں ایک اچھی خاصی تعدادان کی بھی ہوتی تھی جن کا تعلق متمول گھرانے سے تھا- ماضی کے نامور علماء کی سوانح ہمیں بتاتی ہے کہ ان میں سے ایسے بہت سے تھے جو زمین داراور دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اس صورت حال میں اس تیزی سے انحطاط آیا ہے کہ اب ٪۹۵ فی صد طلبہ جو مدارس کا رخ کرتے ہیں ان کا تعلق متوسط یا نچلے طبقے سے ہوتا ہے، آج دولت منداور سیٹھ حضرات بڑی بڑی رقمیں اداروں کو چندے کی صورت میں دے رہے ہیں اور ساتھ میں دینی مدارس کی مالی سرپرستی بھی فرمارہے ہیں لیکن اپنے بچوں کوان اداروں میں بھیج کر عالم دین بنانے میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں، کیوں؟ مدارس کو وہ لاکھوں روپے دینے کو تیار ہیں، اپنے بچے دینے کو راضی نہیں، جب کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم سے غافل نہیں ہیں، اپنے بچوں کو یہ لوگ موٹی موٹی رقمیں Donation کے طور پر دے کر ملک کے نامور کالجوں اوراسکولوں میں تعلیم دلا رہے ہیں، مگر دینی مراکز میں اپنے بچوں کو داخل کرنے کا تصور بھی نہیں کرتے-

● متمول گھرانے کے افراد کی طرح ماضی میں شہری علاقوں سے تعلق رکھنے والے بھی کثیر تعداد میں مدارس میں تعلیم حاصل کرتے تھے، لیکن اب مدارس کا سروے ہمیں اس نتیجے پر لے جاتا ہے کہ دینی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی بڑی اکثریت قصبات اور دیہات سے تعلق رکھتی ہے اور بتدریج شہروں کے بچے مدارس کا رخ کرنے کی بجائے اسکولوں میں پڑھنے کو ترجیح دے رہے ہیں اوریہی حالات کم وبیش علماء اور مشائخ کے بچوں کے ہیں، وہ خود عالم دین ہیں مگر اپنے بچوں کو عالم بنانا پسند نہیں کررہے ہیں، آخر کیوں؟

● ان کے علاوہ آخر کیوں مدارس کے فارغین دعوت وتبلیغ کا کام انجام دینے کی

بجائے کمپیوٹر اور انگریزی سیکھ کر چھوٹی موٹی نوکریاں کرنا پسند کر رہے ہیں؟ آخر کیوں جب ایک علاقے میں ایک مدرسے سے دینی ضرورت پوری ہو جا رہی ہے اس کے باوجود وہاں یکے بعد دیگر مختلف مدارس قائم ہوتے جا رہے ہیں؟ آخر کیوں اچھے علماء خطابت اور طریقت کے میدان میں اپنے ہنر آزمانے کو بے تاب دکھ رہے ہیں؟ اور کیوں علماء کے اندر اب دعوت و تبلیغ دین کے حوالے سے وہ اخلاص نہیں رہا جو ان کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا تھا؟

میرا خیال ہے کہ ان تمام ''کیوں؟'' کا جواب آپ تلاش کریں گے تو اس کی تان ''مادیت'' پر جا کر ٹوٹے گی۔

اکیسویں صدی میں مادیت کا جو سیلاب آیا ہے، اس نے زندگی کے منظر نامے کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے، اس لیے دینی مراکز کے اطراف میں رہنے والے افراد اپنے بچوں کے مستقبل کے حوالے سے دیکھی ہوئی مکھی کو نگلنے کو تیار نہیں۔ مادیت کے سیلاب نے جس علاقے کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ہیں شہری علاقے اور خاص طور پر بڑے شہر Metropolitan cities، اس لیے متمول گھرانے کے پروردہ اور شہر سے تعلق رکھنے والے بچے اس تعلیم کو حاصل کرنے کو تیار نہیں جو انہیں امارت و خوشحالی کے ثریا سے غربت اور تنگ حالی کی زمین پر دے مارے۔ رہے وہ علماء اور مشائخ جو دینی مزاج اور حمیت رکھتے تھے اور اسکول و کالج کی تعلیم کی مخالفت میں کبھی جن کی شعلہ نوائی مشہور تھی اور مدارس کی تعلیم کے حصول اور داڑھی و ٹوپی کے التزام پر جن کے مزاج کی گرمی ان کی زبان پر بھی محسوس کی جاتی تھی، خوشحال زندگی کی تمنا میں ان کی وہ مذہبی آگ بھی سرد ہو چکی ہے اور اب بتدریج وہ اپنے بچوں کو ''افسر'' بنا کر ان کی گاڑھی کمائی سے اچھی زندگی گزارنے کی آرزو لیے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ گویا مدارس کا رخ کرنے والے عموماً اب وہ لوگ رہ گئے ہیں جن کا تعلق دیہات و قصبات سے ہے، جہاں ابھی مادیت اور مغربی تہذیب کے سرکش طوفان نے دستک نہیں دی ہے، لیکن اس طوفان کی آمد کی دھمک واضح طور پر محسوس کی جا رہی ہے، اس لیے ہندوستان کے بیشتر دیہاتوں اور قصبوں میں اب وہ پہلے جیسی غربت نہیں رہی، یہ علاقے بھی بنیادی ضرورتوں اور آسائشوں سے مالا مال ہیں اور دیہات کی سادگی اور

انسانیت اپنا رخت سفر باندھ رہی ہے۔ وہاں بھی عیش و طرب کی زندگی کے حصول کے لیے اب لوگ صرف انہی چیزوں کو گلے سے لگانے کی تیاری کر رہے ہیں جو ان کے خوابوں کو تعبیر دیتی ہیں۔ ایسی نازک حالت میں ڈر ہے کہ مدارس میں داخل ہونے والے دیہاتوں اور قصبوں کے یہ غریب اور متوسط طلبہ بھی مستقبل میں دینی تعلیم کے لیے تیار نہ ہوں، اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر مدارس میں کون پڑھے گا؟ ایسی صورت میں پھر وہ جملہ حقیقت کا لبادہ اوڑھے اس افسانوی چراغ کے جن کی طرح میری نوک قلم پر آ جاتا ہے کہ ''آئندہ پچاس برسوں کے بعد مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلبہ میسر نہیں ہوں گے''۔

علماء سے قناعت کا مضحکہ خیز مطالبہ:۔ اب تک کے تجزیے سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ قوم کے افراد کی مدارس اور دین سے برگشتگی کی بنیادی وجہ خوشحال زندگی سے محرومی ہے، اسی طرح سماج میں علماء کی بے وقعتی اور بے اعتباری کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کی محنتوں کا معاوضہ اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا ایک معمولی آفس میں کام کرنے والے کلرک کا ہوا کرتا ہے، یہ دنیا کے افراد جن میں عام آدمی سے لے کر دانشوران تک اور مدرسے کے منتظمین سے لے کر مساجد کے ذمہ داران تک سبھی شامل ہیں، اتنے خود غرض ہو چکے ہیں کہ وہ خود اپنے لیے دنیا بھر کی آسائشوں کی تمنا کرتے ہیں اور ان کے حصول کے لیے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے، لیکن علماء سے خودی اور نفس کی حفاظت کرتے ہوئے توکل و قناعت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کے اس مطالبے پر کبھی غور کرتا ہوں تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے، کیونکہ شرعی رو سے توکل و قناعت کا مطالبہ اس طبقے سے کیا جانا چاہیے جس کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہو، اس کے باوجود اس کی ہوس کم نہیں ہوتی، جن بے چاروں کو مہینے کی آخر میں اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے سوچنا پڑتا ہو ان سے توکل و قناعت کا مطالبہ ایک بھونڈا مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

اسلام میں غربت کو ایک مرض کہا گیا ہے اور اس مرض کا علاج بتایا گیا ہے تاکہ مسلم سماج کا پسماندہ طبقہ چین کی سانس لے سکے اور اسلامی دستور کے زیر سایہ اپنی خودی اور نفس کی حفاظت کر سکے۔ آج شورش پسند اور سازشی عناصر نے اسی ''غریبی'' کا استحصال کر کے

اس کی آڑ میں لادینیت اور جرائم کا کاروبار پھیلا رکھا ہے- ہندوستان میں لاکھوں دلتوں کا عیسائی اور بدھ مذاہب کو قبول کرنا، کسانوں کا روز بروز اجتماعی خودکشی کرنا، پڑھے لکھے نوجوانوں کا جرائم کی دنیا میں قدم رکھنا اور علماء کا سطحی حرکتوں کا ارتکاب کرنا اس کی واضح مثالیں ہیں- اسلامی تعلیمات سے غفلت اور مسیحی و جبری پروپیگنڈے نے ہمیں اس موڑ پر لاکھڑا کر دیا ہے جہاں ہم غربت وافلاس کو اسلام کا نظریہ سمجھنے لگے ہیں، جب کہ قرآن و حدیث کے ذخیرے سے ایسی کسی آیت یا حدیث کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جس میں غربت وافلاس کو سراہا گیا ہو، وہ حدیثیں جن میں زہد و پرہیزگاری اور دنیا سے کنارہ کشی کی تعریف کی گئی، ان کا غریبی اور ناداری کی تعریف سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اس لیے کہ دنیا سے کنارہ کشی کی تلقین اسی سے کی جائے گی جو اپنی دولت وامارت کے ذریعے دنیاوی عیش وعشرت میں مگن ہو کر اپنے مذہب سے غافل ہو گیا ہو، وہ شخص جس کے پاس اپنی بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی پیسہ نہ ہو وہ ویسے ہی دنیا سے کنارہ کش ہے، اس سے مزید کنارہ کشی کا مطالبہ تحصیل حاصل کے سوا اور کیا ہے؟ قناعت کی تعلیم جن احادیث میں ملتی ہے ان کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ انسان کیڑے مکوڑے جیسی زندگی گزارے اور خوشحال زندگی کی مطلق تمنا نہ کرے یا دولت مند عیش وطرب میں مست رہ کر فضول خرچی کرتا رہے اور شرعی حدود کی پاسداری بھی نہ کرے- اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام دولت کو نعمت سمجھتا ہے اور اپنے بندوں کو بطور احسان گنواتا ہے، اس دولت کے حصول پر اپنے رب کی بارگاہ میں شکر ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور غریبی کو مصیبت قرار دے کر اس سے پناہ مانگنے کی تلقین کرتا ہے— علماء سے توکل کا مطالبہ کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ علماء کا تعلق بھی اسی دنیا سے ہے، وہ بھی حضرت آدم کی اولاد ہیں، ان کی بھی اپنی ضرورتیں ہیں، خالی جیب نہ مذہب کی قیادت ہو سکتی ہے اور نہ مذہب وملت کی شیرازہ بندی کے لیے غور وفکر میں گہرائی پیدا ہو سکتی ہے، بلکہ معاشی تنگ حالی ذہن وفکر کو اتنا مفلوج کر دیتی ہے کہ بڑے بڑے باصلاحیت علماء بھی زندگی سے مایوس ہو کر کنج نشیں ہو جاتے ہیں-

مشکلات کا واحد حل:- اگر ہم چاہتے ہیں کہ دین ومذہب کی شمع یونہی فروزاں رہے تو

دینی مدارس کی بقا نہایت ضروری ہے- لیکن جس طرح مکین کے بغیر کوئی گھر مکان نہیں ہوتا اسی طرح طلبہ کے بغیر کوئی عمارت، مدرسہ نہیں ہوسکتی، طلبہ مدارس میں داخل ہوں گے تو علماء حفاظ اور محققین بن کر نکلتے رہیں گے اور دین کا کارواں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے گا، علماء ہی نہ ہوں گے تو نہ مساجد آباد رہیں گی نہ دینی مراکز زندہ رہیں گے اور نہ اسلام اپنی اصل ہیئت میں معاشرے میں باقی رہے گا- میرے نزدیک ایسی نازک حالت میں مدارس کے تحفظ کا صرف ایک راستہ ہے کہ علماء کو ان کی محنتوں کا بدل اسی طرح ملے جس طرح عصری علوم حاصل کرنے کے بعد دیگر لوگوں کو ملا کرتا ہے، آج لوگ علماء اور مدارس سے بیزار ہو کر اسکول وکالج کا رخ صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ وہاں سے معیشت کے دروازے کھل جاتے ہیں، اگر مدارس بھی ایک ممکنہ حد تک اس کا بدل پیش کریں تو یقیناً والدین اپنے بچوں کو مدارس میں بھی اسی جوش وخروش سے بھیجیں گے جس طرح وہ اسکول بھیجا کرتے ہیں- یہ راستہ ایسا مشکل بھی نہیں کہ جس کی طرف پیش قدمی نہ کی جاسکتی ہو-

میری سمجھ میں آج تک یہ نہیں آسکا کہ مدارس کے علماء اور مساجد کے ائمہ کو تنخواہیں اتنی کم کیوں دی جاتی ہیں، اس ناتواں روایت کا سرا ڈھونڈھنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا، اگر مدارس ومساجد کے منتظمین اس کی توجیہ یہ پیش کرتے ہیں کہ عوامی چندے سے مدارس ومساجد چلتے ہیں اور چندے سے اچھی تنخواہیں دینا ممکن نہیں تو یہ عذر مدارس ومساجد کی تعمیر میں کیوں نہیں پیش کیا جاتا جہاں لاکھوں کروڑوں روپے صرف ان کی تعمیر وتزئین میں خرچ کر دیے جاتے ہیں اور یہ معذرت خواہانہ رویہ ان جلسوں کے انعقاد پر کیوں نہیں ہوتا جہاں ایک ایک رات میں لاکھوں روپے فضول پانی کی طرح بہادیے جاتے ہیں- اگر مدارس ومساجد کی تعمیر اور جلسہ وجلوس کے انعقاد کے لیے آپ لاکھوں کروڑوں جمع کر سکتے ہیں تو علماء اور ائمہ کی اچھی تنخواہوں کے لیے کوششیں کیوں نہیں کی جاسکتیں؟

میری رائے میں جن اداروں میں دوسو طلبہ کی گنجائش ہے وہاں ڈیڑھ سو ہی رکھیں جائیں، جہاں سو طلبہ کی گنجائش ہے وہاں پچاس ہی رکھے جائیں اور اس بجٹ سے مدرسین کو اچھی تنخواہیں اور سہولیات فراہم کی جائیں- آج بین الاقوامی سطح پر مادیت کا جو طوفان اٹھا

ہے اس پر بند تو نہیں باندھا جا سکتا، لیکن اس طوفان سے لڑنے کے لیے انہیں تیار ضرور کیا جا سکتا ہے اور یہ جنگ انہیں معاشی طور پر مستحکم کر کے ہی لڑی جا سکتی ہے، ہمارے بچوں کو اگر دینی تعلیم کے حصول سے خوشحال زندگی کی ضمانت ملنے لگے تو یقیناً مدارس کی تعمیر بھی ہوتی رہے گی اور توسیع بھی، علم وفن میں جلا بھی پیدا ہوگا اور فکر ونظر میں گہرائی بھی، اس طرح اچھے علماء معاشرے میں پیدا ہوتے رہیں گے جو باعزت طریقے سے ملت کی مذہبی قیادت کر پائیں گے- اگر خدانخواستہ اس آواز کو مجنوں کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا تو آنے والا وقت دین ومذہب کے حوالے سے نہایت خطرناک نتائج لے کر آنے والا ہے، پھر اس وقت غور و فکر کے سارے دروازے شاید بند ہو چکے ہوں گے-

علماء نے ہمیشہ طوفانوں کی زد پر دینی شوکتوں کا چراغ جلایا ہے، اس کام کے لیے نہ انہوں نے کبھی وسائل کے فقدان کا مرثیہ پڑھا اور نہ کارواں بننے کا انتظار کیا، آج جب مدارس کے حوالے سے دین کا تحفظ ناگزیر ہو گیا ہے تو اس کام کے لیے بھی کسی سیٹھ، ساہوکار یا منتظم ادارہ کی پیش قدمی کا انتظار وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں- پورے ہندوستان میں ۹۹٪ فی صد دینی مراکز کا قیام کسی نہ کسی عالم دین کی ہی فکری اور عملی جدوجہد کا مظہر ہے اور ان اداروں کا انتظام واہتمام بھی بیشتر علماء کے ہی ہاتھوں میں ہے، اس لیے اپنے علماء کے معاشی استحکام کی تحریک کے لیے انہیں ہی قدم بڑھانا ہوگا- آج اگر مسلم معاشرہ اس کمزور روایت کی تبدیلی کو ہضم نہیں کر پاتا ہے تو اس کے ذمہ دار بھی ہم ہی ہیں، صدیوں سے آئیڈیل علماء کے سلسلے میں بے لوثی، بے غرضی اور توکل وقناعت کی حکایتیں اور روایتیں سنا سنا کر ہم نے اس کی بصارتوں کے ساتھ بصیرتوں کو بھی اتنا کمزور کر دیا ہے کہ نہ اسے علماء کی مادی ضرورتوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں اور نہ ان کے بے آب چہروں کی کثافتیں دکھتی ہیں، اس لیے وہ خود تو کوٹھیوں اور عالی شان مکانوں میں زندگی کی جملہ آسائشوں کے ساتھ رہتا ہے اور علماء کو جھوپڑیوں اور کرائے کے مکانوں میں دیکھنا پسند کرتا ہے، وہ خود تو مساجد میں چار پہیوں اور دو پہیوں کی گاڑیوں سے نمازیں پڑھنے کے لیے آتا ہے اور اپنے امام کو زمین پر رینگتے ہوئے یا سائیکلوں میں آتا دیکھنا چاہتا ہے- علماء اور دیگر افراد کے درمیان اسی

معاشی فرق نے معاشرے کے دلوں سے علماء کے وقار کو ختم کر دیا ہے، اس لیے اس فاصلے کو مٹا کر علماء کو سماج میں باعزت بنانے کے لیے خود انہیں ہی پیش رفت کرنی ہوگی اور معاشرے کے بوجھل کانوں اور آنکھوں کو اس کا عادی بنانا ہوگا-



مسلمانوں کی ترقی اسلام کی ترقی نہیں

۱۸۵۷ء کے بعد تحریک سرسید نے مسلمانوں کو کیا دیا؟ ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

''ترقی'' ایک ایسا لفظ ہے جس کے مفاہیم، انطباقات (Applications) اور معانی مختلف الجہات (Multi-dimensional) ہیں۔ ترقی کا معیار علم وفکر کی بلندی بھی ہوسکتی ہے، مال ودولت کی فراوانی بھی، اخلاق وتمدن کا اعلیٰ معیار بھی اور مذہبی نظریات کی عملی کوششوں کا کامیاب فروغ بھی۔ اس ترقی میں استثنائی طور پر اسلام کی ترقی کے علاوہ دنیا کی ہر ترقی کے نتائج ایک یا دو شعبوں کو محیط ہوتے ہیں۔ مثلاً، اس سلسلے میں اس حقیقت کو تو تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ علم وفکر کی ترقی عقل وشعور کو بالیدگی عطا کرتی ہے، مال ودولت کی ترقی انسان کو معاشی واقتصادی طور پر خوش حال کرتی ہے، اخلاق وتمدن کی ترقی صالح قدروں کو رواج دیتی ہے اور اسلام کی ترقی اعلیٰ کردار کے حامل انسان کو پیدا کرتی ہے، لیکن یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مال ودولت کی ترقی سے علم وفکر کی ترقی بھی ہوتی ہے یا اخلاق وتمدن کی ترقی سے مال ودولت کی کثرت ہوتی ہے، اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یقینی طور پر اس کی سمجھ پر سوالیہ نشان قائم ہوجاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کا کاروان زندگی لٹ پٹ گیا تو برصغیر میں کئی ایسے مسلم لیڈران ابھرے جو اسی طرح کی ایک غیر حقیقی وغیر فطری سوچ کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشی ترقی کے لیے جدوجہد کرنے لگے کہ ''مسلمانوں کی ترقی سے اسلام کی بھی ترقی ہوگی''۔ بدقسمتی سے یہ غیر واقعی سوچ مذکورہ لیڈروں کی تحریک کے ڈائرکٹ یا ان ڈائرکٹ اثرات قبول کرنے والے مسلمانوں میں بھی پیدا ہوگئی، جس کو آج تک وہ اپنی تقریرو

تحریر میں ڈھورہے ہیں، حالانکہ ۱۸۵۷ء کے بعد ڈیڑھ سو سالہ مشاہدے اور تجربے نے اس سوچ کو عملی طور پر یکسر مسترد کردیا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی سے اسلام کا فروغ ہوا ہے۔

اس فکر کی ایک واضح مثال ایم اے او کالج موجودہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے، سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء/۱۸۹۸ء) نے جس کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں ڈالی، جو آگے چل کر ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی قرار پایا، ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید نے حالات سے متاثر ہوکر مسلمانوں کی علمی ومعاشی ترقی کے لیے تحریک علی گڑھ چلائی، بہت سے لوگوں نے اس تحریک کی حمایت کی تو کچھ نے مخالفت بھی کی، اس حمایت ومخالفت سے قطع نظر اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ تحریک علی گڑھ کا بنیادی مقصد مسلمانوں کا معاشی وسیاسی استحکام تھا، نہ کہ مذہبی استحکام۔ مگر اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ بشمول سرسید اس دور کے اکثر حامیان تحریک علی گڑھ کو یہ یقین تھا کہ مسلمانوں کی ترقی سے بالواسطہ اسلام کو استحکام حاصل ہوگا، ان کے اس یقین اور تمنا کا پتہ ان کے اس نقطۂ نظر سے لگتا ہے:

> ''میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ، ان میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں پر خوفناک، ان میں نہایت قوی استدلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا، ان کو نہایت دانا اور عقل مند پاتا ہوں پر اکثر مکر وفریب اور غرور سے ملے ہوئے، ان میں صبر وقناعت بھی اعلیٰ درجے کی ہے مگر غیر مفید اور بے موقع۔ پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم وتربیت سے آراستہ ہوجائیں تو دین اور دنیا دونوں کے لیے کیسی کچھ مفید ہوں''۔

مگر علی گڑھ کی سوا سو سالہ تاریخ نے اس مفروضہ یقین کو غلط ثابت کردیا۔ اس میں دو رائے نہیں کہ ایم او کالج کے قیام نے بے شمار مسلمانوں کو معاشی وسیاسی استحکام عطا کیا، لیکن ہندوستان میں اسلام کو اس تحریک نے نہ کل کوئی فائدہ پہنچایا اور نہ آج کوئی فروغ حاصل ہورہا ہے، بلکہ مسلمانوں کے درمیان تحریک سرسید کی علمی وفکری نخوت نے یونیورسٹی کے اندر بے شمار کمیونسٹ مزاجوں کو پیدا کیا، جنھوں نے اپنی سرشت اور طبیعت کے مطابق اسلام کی

خود ساختہ تشریح کی اور علمائے اسلام کی کردارکشی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، تصوف کو کبھی رہبانیت کا منبع کہا تو کبھی افیون جو زندگی سے گریز کی تعلیم دیتا ہے یا ایسا سفسطہ یا نشہ جو عقل و حواس کو پرانی شراب کی طرح مختل کر دیتا ہے۔

اسی مزاج کے ایک پروردہ ڈاکٹر عارف الاسلام کا ۶۲۴ صفحات پر پھیلا تازہ ناول ''اتاترک فی کربلا'' (بحرحقیقت) میرے پیش نظر ہے۔ مشمولات کے بغور مطالعے اور اس میں اشعار کے کثرت استعمال سے اندازہ ہوا کہ یہ وہ بحر نہیں جس میں غواصی کی جاتی ہے بلکہ وہ بحر ہے جس میں وزن کے ساتھ زندگی کی حقیقت کی عکاسی کی جاتی ہے، اس میں زندگی کے عروض سے واقفیت شرط اول ہے، افسوس! اسی عروض سے ناواقفیت نے پوری کتاب کو بے وزن کر دیا ہے اور اب بجز بحرحقیقت کے یہ ''بحرغرابت'' ہو گئی ہے۔ اس کے عجائب وغرائب کے مطالعے کے بعد میرے ذہن میں جو پہلا تاثر ابھرا وہ وہی ہے جو ''شیطانی آیات'' کے مطالعے کے بعد معروف صحافی ارن شرما کے قلم سے نکلا تھا:

''تیسرے درجے کی تھیم، دوسرے درجے کا مصنف اور اول درجے کا کاغذ''

Third rate theme by a second rate author on a first rate paper

مگر اس میں تھوڑے سے تصرف کے ساتھ میرا تاثر یہ ہے کہ:

تیسرے درجے کی زبان، دوسرے درجے کی تھیم اور اول درجے کا کاغذ

دوسرے درجے کی تھیم یہ ہے کہ تحریک علی گڑھ اور سرسید کے مذہبی عقائد و نظریات کی مخالفت جن چند علماء نے کی تھی صرف وہی نہیں بلکہ چودہ سو برسوں میں پیدا ہونے والے تمام علماء قابل ملامت و نفرت ہیں اور اسلام کی شکست و ریخت اور مسلم نسلوں کی بربادی کی وجہ بھی یہی ہیں۔ اگر سرسید نے پیش قدمی نہ کی ہوتی تو ہندستان کا مسلمان اپنے مذہب کو چھوڑ چکا ہوتا۔

اس کے اظہار کے لیے موصوف نے بلاتفریق مسلک و جماعت پورے طبقۂ علما کی شان میں جو تیسرے درجے کی زبان استعمال کی ہے اس کے چند نمونے آپ بھی ملاحظہ کریں:

- ''اسلام کی شکست کا سبب کوتاہ نظر حامیان اسلام (علماء) ہی بنے۔'' (ص:۲۶۶)
- ''سرسید دنیائے اسلام کے پہلے آدمی تھے جنھوں نے دینی علماء کے غلط تصورات کو سمجھا۔'' (ص:۲۶۸)
- ''ہر طبقۂ فکر کے دینی علماء جیسے دیوانے ہو گئے تھے سرسید کے خلاف۔'' (ص:۲۶۸)
- ''تیسری ہی صدی میں مذہبی تقدیر پرست علماء نے معتزلہ کو شکست دینے کے لیے علم کے معنی میں تحریف کر دی۔'' (ص:۲۶۹)
- ''عقل کا تو مولوی سخت دشمن ہے۔'' (ص:۲۶۹)
- ''علماء فقہی اختلاف کو ہوا دے کر اپنا گروپ بناتے ہیں اور ایک نیا مدرسہ کھول لیتے ہیں پھر زکوۃ، صدقات اور چرم قربانی کے ڈھیر لگ جاتے ہیں، باقی تعویذ بیچتے اور جادو ٹونے کے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔'' (ص:۲۷۰)
- ''ہزاروں معصوم بچوں کو ہمیشہ کے لیے محتاج بنانے کا کام کر رہے ہیں یہ مدارس۔'' (ص:۲۷۰)
- ''(مدارس) غاصبین زکوۃ پیدا کر رہے ہیں۔'' (ص:۲۷۱)
- ''اس (طبقہ علماء) نے دنیاوی اور دینی عمل کے معنی میں تفریق کر دی۔'' (ص:۲۷۱)
- ''عذاب الٰہی کا اتنے وثوق سے ذکر کیا جاتا ہے جیسے اللہ میاں نے خود انہیں بتایا ہے۔'' (ص:۲۷۱)
- ''کتنے بے شرم ہیں یہ لوگ۔'' (ص:۲۷۴)
- ''سرسید کے خلاف بھی اللہ رسول کو استعمال کیا ان لوگوں نے....... پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے مولوی خود آگے نہیں آتا، قرآن و حدیث کو آگے کرتا ہے اور پیچھے سے شکار کھیلتا ہے۔'' (ص:۲۷۴)
- ''مدارس کو ذاتی جاگیر بنانے سے لے کر قومی اور بین الاقوامی معاملات میں ہر جگہ اسلام کا نام نامی استعمال کیا جاتا ہے اور عیش کی بنسی بجائی جاتی ہے۔'' (ص:۲۷۴)
- ''مولویت کا وہ زہر ہے جو علی گڑھ کی رگوں میں سرایت کر رہا ہے۔'' (ص:۲۷۶)

- ''مولوی علی بخش نے ایک کتاب لکھی ''تائید اسلام'' جس میں سرسید پر جھوٹے الزام لگائے گئے لیکن وہ ایسے مشہور ہوئے کہ تمام دنیا وہی کہتی ہے جو یہ کاذب کہہ گیا۔'' (ص:۲۷۷)
- ''فضلائے اسلام ہر جھوٹ کو ہوا دینے میں ماہر ہیں........(یہ فضلاء ایسے ہی ہیں) جیسے یہ ٹوٹی کرسی فاضل پڑی ہے، انگریزی میں ایکسٹرا بیکار اور فضلے کے معنی تو تم جانتے ہی ہو........(یہ کہہ کر) پورے ماحول میں بدبو پھیلا دی۔'' (ص:۲۷۷)
- ''(ایک دن ایک مولوی گھرانے کے لکچرار نے مجھ سے پوچھا کہ) کیا سرسید نے آخری زمانے میں اپنے عقائد سے توبہ کر لی تھی؟ ہمیں کہاں یہ برداشت، میں نے کہا سن بے پروفیسر! توبہ کریں غزالی، افغانی، توبہ کریں نانوتوی، علی میاں، مودودی، رضا خاں اور توبہ کر تو، ہزار بار بھی توبہ کرے گا تب بھی سرسید کی داڑھی کے ایک بال کے برابر بھی نہ ہو سکے گا مذہب میں۔'' (ص:۲۷۸)
- معتزلہ فلسفہ بنیادی طور سے یہی تھا کہ کائنات عدل پر قائم اور انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے، لہذا ذمہ دار بھی، اور اسی لیے جنت دوزخ کا حق دار ٹھہرا، مگر یہ فلسفہ عقل دشمن طبقے کو پسند نہیں آیا..........بس یہیں سے ابوالحسن اشعری کی قیادت میں اندھی تقدیر پرستی کا دور شروع ہوا....عقل پرستوں کو مکمل شکست غزالی کی وجہ سے ممکن ہو سکی......اب نئے دور کے مجدد اسلام جس نے عقلیت کو اسلام میں دوبارہ رواج دیا سرسید ہیں۔'' (ص:۲۸۱)
- ''سرسید نے مولوی کیے اسلام کی جڑ ہی کاٹ دی۔'' (ص:۲۸۲)
- ''مغرب کو گالیاں دیتے دیتے مولوی کی زبان نہیں تھکتی۔'' (ص:۲۸۷)

اس طرح کی تیسرے درجے کی زبان سے پوری کتاب داغدار ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص کو ہر شخص سے اختلاف رائے کا حق ہے، جس طرح علماء نے سرسید سے اختلاف کیا اسی طرح سرسید نے علماء سے اختلاف کیا، اس میں اصنام پرستوں کی طرح اپنے مفروضہ بت کی انہدامی پر چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں تھی، اگر سرسید کا تعلق انسانی برادری سے

ہے فرشتوں سے نہیں اور وہ اسی زمین کے باسی ہیں آسانی نہیں تو پھر کوئی بھی ان سے اختلاف کر سکتا ہے۔ اس طرح کے اختلافات سے پوری دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے، مگر سرسید سے اختلاف کے نتیجے میں موصوف نے جو زبان استعمال کی ہے اس سے چمن سرسید کی تہذیبی و علمی قدروں کے زوال کا یقین ہو چلا ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے عجائب وغرائب ہیں جن میں موصوف نے اپنے خود ساختہ اسلام کی جس طرح تعبیر کی ہے، اس کی متوارث حقیقتوں کا جس طرح انکار کیا ہے اور علماء کی جتنی توہین کی ہے وہ قابل فریاد ہے۔ سردست یہاں مجھے ان تمام غرائب پر تبصرہ نہیں کرنا ہے بلکہ موصوف کے صرف اس خوش فہم نقطۂ نظر پر تبصرہ کرنا ہے جو انھیں ورثے میں ملی ہے کہ ''تحریک سرسید نہ ہوتی تو ہندوستان کا مسلمان اپنے مذہب سے ہاتھ دھو بیٹھتا''۔

اس بحر حقیقت کو انہوں نے ''در حدیث دیگراں'' کے رنگ میں اس طرح بیان کیا ہے:

''اگر سرسید زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی اتنے چالاک و اسمارٹ (خود غرض) ہو جاتے جتنے ہم ہیں تو میرا دعوی ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے گھروں میں شولنگ کی پوجا کر رہا ہوتا۔ اسپین سے زیادہ بری حالت ہوتی یہاں۔ بزور طاقت یا نکال دیا جاتا یا ہندو بنا لیا جاتا، ہم لوگ تو ابھی یہ بھی نہیں جانتے کہ سرسید تحریک نہ ہوتی تو ہمارا کیا ہوتا۔'' (ص:209)

آگے دوسرے کردار سے موصوف کہلواتے ہیں:

''وہاں تو پورا اسپین مسلمانوں سے خالی ہو گیا، ساری مساجد، بڑے بڑے مدارس اور خانقاہیں یوں ہی خالی پڑی رہ گئیں، بڑے بڑے علماء اور صوفی پیر رکھ کر بھاگے۔ اگر سرسید احمد نے وقت کو نہ پہچانا ہوتا اور بروقت مداوا نہ کیا ہوتا تو اسپین سے برا حال یہاں ہمارا ہوتا۔'' (ص:210)

یہ دونوں اقتباسات خلط مبحث کا بدترین نمونہ ہیں، تاریخ کے واقف کار اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوستان اور اسپین کے زوال کے اسباب مختلف تھے، اسی طرح دونوں ملکوں

کے ماضی کے سیاسی، مذہبی اور علمی وسماجی حالات بھی مختلف، مگر موصوف نے دونوں ملکوں کی تاریخ کے اسباب وحالات کا یک رخی نتیجہ نکال کر اپنے موروثی فکر کی تائید میں جس طرح تاریخ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے وہ مضحکہ خیز ہے-

انیسویں صدی کے نصف اول میں جب ہندوستان پر انگریزی اقتدار قائم ہوگیا تو انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی، علمی، اقتصادی اور فکری وجاہت کو ختم کرنے کے لیے انہیں سرے سے تعلیم یا عصری تعلیم سے روکنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ مذہبی تعلیم پر پابندی عائد کی، اردو، فارسی اور عربی زبانوں کو ختم کرنے کی کوشش کی اور دوسرے احکام شرعیہ پر قدغن لگائے- جیسا کہ معلوم ہے کہ ۱۸۳۴ء میں برطانیہ کا مشہور مدبر لارڈ میکالے Thomas Babington Macaulay لندن سے ہندوستان آیا، اس نے ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیا اور برٹش اقتدار کو مضبوط تر کرنے کے لیے ایک تعلیمی اسکیم بنائی، جو انگریزی زبان اور دوسرے سیکولر علوم پر مشتمل تھی، یہ اسکیم جس مقصد کے زیر اثر بنائی گئی وہ خود میکالے کے الفاظ میں یہ تھا کہ

''تا کہ یہاں ایک ایسی نسل اٹھے جو کہ پیدائش کے اعتبار سے ہندوستانی اور فکر کے اعتبار سے انگریز ہو''-

So that a generation may arise, which is Indian in birth and Enlgish in thought.

برٹش حکومت کے انہیں عزائم کے تعلق سے انقلاب ۱۸۵۷ء کے مجاہد اعظم علامہ فضل حق خیرآبادی (م:۱۸۶۱ء) نے اپنی مشہور زمانہ کتاب الثورۃ الہندیہ (باغی ہندوستان) میں لکھا ہے کہ:

''انہوں (انگریزی حکومت) نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف تسلط وقبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہو گا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا، اس لیے پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب وملت کو مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر وحیلہ سے کام لینا شروع کیا، انہوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان ودین کی تلقین

کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے، پچھلے زمانے کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی''- (باغی ہندوستان: ص:۳۱: مطبوعہ المجمع الاسلامی، مبارک پور)

مزید فرماتے ہیں: ''ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے، مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف وپردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکام دین مبین کو مٹانا وغیر ذالک''- (ایضاً)

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں تقریباً ایک ساتھ دو تعلیمی تحریکیں اٹھیں ایک عصری دوسری دینی ومذہبی- پہلی کی نمائندگی سرسید کر رہے تھے جو لارڈ میکالے کا نشانہ تھی، جبکہ دوسرے کی نمائندگی انفرادی طور پر علماء کر رہے تھے جو میکالے کے مشن اور چیلنج کا خاموش جواب تھی- گویا سرسید کی تحریک وقت کا تقاضا تھی تو علماء کی تحریک دین کا تقاضا-

دین کے اسی تقاضے کی تکمیل کے لیے ڈیڑھ سو برس میں ہزاروں علماء نے بے شمار قربانیاں دی ہیں، انہی ایثار وقربانیوں کا نتیجہ ہے کہ آج پورے ہندوستان میں شمال سے جنوب تک مدارس ومساجد کا جال بچھ گیا ہے، ڈیڑھ سو برس پہلے ایک انسٹی ٹیوشن کی شکل میں مدارس کے قیام کا آغاز کرنا اور پھر اسے تواتر کے ساتھ جاری رکھنا کوئی معمولی بات نہیں تھی، کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد موجودہ ہندوستان میں کبھی بھی مسلمانوں کو اقتدار حاصل نہیں ہوسکا اور ۱۹۴۷ء سے پہلے اور بعد کی تمام حکومتیں ان دینی مراکز کو ختم کرنے کے درپے رہیں جہاں سے شریعت محمدی کی اشاعت اور تحفظ کے لیے نسل در نسل علماء تیار کیے جاتے رہے اور ان کے ذریعے مسلم معاشرے میں اپنے دین کو سمجھنے اور جاننے کا عمل مسلسل جاری رہا- ڈیڑھ سو برس قبل کسی عالم کے لیے یہ تو آسان تھا کہ وہ دین کے تحفظ اور اس کی اشاعت کے لیے کوئی پلان یا منصوبہ پیش کر دے یا کسی ایک بڑے دارالعلوم کے قیام کے لیے ابتدائی مدرسہ کھول دے، لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی ایک عالم اپنی چند سالہ عمر کے اندر پورے ہندوستان میں دینی مدارس قائم کر دے اور دین کو زندہ رکھنے کے لیے نسل در نسل مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بناتا رہے- اس کے لیے ضرورت تھی کہ اس ڈیڑھ سو برس میں تواتر کے ساتھ

ایسے جفاکش علماء کی نسل تیار ہوتی رہے جو اس تعلیمی تحریک کو مسلسل جاری رکھ سکے اور ہندوستان میں دین کے احیاء اور تجدید کا کام ہو سکے- یہ ناقابل یقین عمل بھی علماء نے بے مثال قربانیاں دی کر اپنے انجام کو پہنچا دیا، حالانکہ انہیں پیشگی معلوم تھا کہ اس تعلیمی تحریک کے نتیجے میں انہیں قناعت پر گزر بسر کرنی ہوگی، اپنے اہل وعیال کو اللہ کے حوالے کر کے دین کے تابناک مستقبل کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا ہوگا، ساری عمر معمولی تنخواہوں پر زندگی گزارنی ہوگی، حتی کہ عزت نفس کا سودا کر کے اس مشن کو کامیاب کرنے کے لیے چندے جیسے مشکل اور کمترین کام کو بھی کرنا ہوگا، کیونکہ پورے ملک میں اس مذہبی تعلیمی نظام کو عام کرنے کے لیے اسے فری ایجوکیشن کے تحت چلانا تھا جو چندے کے بغیر ممکن نہیں تھا، مگر یہ عظیم قربانی بھی انہوں نے اپنے اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے پیش کی-

علماء کی اس ڈیڑھ سو سالہ عظیم جدوجہد اور قربانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین کی اشاعت اور اس کے تحفظ کے لیے بے شمار علماء پیدا ہوئے، ان علماء نے عام مسلمانوں کو قرآن سمجھانے کے لیے اس کے مختلف تراجم کیے، اس کی تفسیریں لکھیں، احادیث رسول کی تعلیم کے لیے اس کے ترجمے کیے، حالات کے تحت ابھرنے والے بے شمار مسائل کا شرعی حل دریافت کیا، صفائے قلب اور تصفیہ باطن کے لیے مختلف موضوعات پر ہزاروں کتابیں لکھ ڈالیں، احکام شریعت منضبط کیے، انہیں آسان لفظوں میں پیش کر کے عام مسلمانوں کے لیے قابل عمل بنا دیا، مساجد میں امامت کرنے والے، اور قرآن کی تعلیم دینے والے افراد معاشرے میں پیدا کر دیے تاکہ امت مسلمہ ہمیشہ اپنے دین پر عامل رہ کر اسے محفوظ رکھ سکے-

ان تمام تاریخی شواہد کے نتیجے میں یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ اگر ۱۸۵۷ء کے بعد علماء کے ذریعے برپا کی گئی یہ مذہبی تعلیمی تحریک نہ ہوتی تو ہندوستان کا مسلمان اپنے گھروں میں شیولنگ کی پوجا کر رہا ہوتا-

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید کی تعلیمی تحریک وقت کا جبری تقاضا تھی، اس تحریک نے مسلمانوں کو معاشی اور علمی ترقی دے کر ہندوستان میں باعزت بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے، لیکن یہ درست نہیں کہ یہ تحریک نہ ہوتی تو ہندوستان کا مسلمان اپنے دین و مذہب سے

بیگانہ ہو جاتا- سرسید کی تمنا تھی کہ اس تحریک کے ذریعے سیکولر علوم اور یورپ کے سائنسی علوم میں مسلمان ترقی کریں، جس میں بلاشبہ انہیں کامیابی بھی ملی، سو سال کی اس تحریک نے بے شمار مسلمانوں کو ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں اور تاجر بنا کر انہیں معاشی طور پر مستحکم کر دیا، مگر یہ ان کی ذاتی ترقی تھی، اس ترقی سے نہ اسلامی علوم وفنون نسلوں میں منتقل ہو سکے کہ شریعت محمدی کو تحفظ فراہم ہو سکے، نہ اسلام کی تفہیم کے لیے سیکڑوں کتابیں وجود میں آسکیں جو معاشرے کو صالح مذہبی اقدار پر عامل کر سکیں، نہ امت کی مذہبی قیادت وامامت کرنے والے افراد پیدا ہو سکے کہ منبر ومحراب آباد رہیں اور معاشرے میں اصلاحی عمل جاری وساری رہ سکے اور نہ دین کے وہ مراکز روئے زمین پر قائم ہو پائے جو مذہب کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے والے معاون علماء پیدا کر سکیں- اگر ایسا ہوتا تو یقیناً یہ کہنا درست ہوتا کہ تحریک سید نہ ہوتی تو ہندوستانی مسلمان اپنے مذہب وملت سے بیگانہ ہو جاتا-

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ملکی وبین الاقوامی مصنفین نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں کہ تحریک علی گڑھ کا بنیادی مقصد کیا تھا اور اس تحریک کے نتیجے میں کس طرح کے افراد پیدا ہوئے- اس سلسلے میں برطانوی مصنف ڈیوڈ لیلی ولڈ David Lelyveld کی مقبول عام کتاب ”علی گڑھ فرسٹ جنریشن“ Aligarh's First Generation قابل ذکر ہے، جو علی گڑھ کے قیام کے مقصد اور ۱۸۷۵ء سے ۱۹۰۰ء تک کی پہلی نسل کے حالات پر مشتمل ہے- اس کتاب کے مصنف نے واضح طور پر کہا ہے کہ علی گڑھ کے قیام کا مقصد مسلمانوں کو برٹش حکمرانوں سے قریب تر کرنا، انہیں معاشی طور پر مستحکم کرنا اور تنگ نظر مسلم نوجوانوں کو پبلک لیڈرشپ کے لیے تیار کرنا تھا تاکہ سیاسی استحکام حاصل ہو، مگر سرسید کے ذہن میں جو خاکہ تھا وہ پہلی نسل سے پورا نہ ہوا اور وہاں سے ممتاز لیڈر پیدا نہ ہو سکے بلکہ زیادہ تر ایسے نکلے جو محض گریجویٹ ہونے کے بعد گورنمنٹ آفیسز میں ملازم ہو گئے اور اس کے بعد پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں گئے- اسی حقیقت کو اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے جس کو مصنف نے اپنی کتاب میں بھی نقل کیا ہے:

”انھوں (علی گڑھ کے فارغین) نے بی اے کی ڈگری لی، ملازمت حاصل

کی، اپنی پینشن لی اور پھر مر گئے-''

They got their B.A.,took employment,drew their pensions and then died (P:322)

''اتاترک فی کربلا'' کے مصنف کو مشرق کے مقابلے مغرب اور مغربی لوگوں پر بڑا اعتماد ہے، جیسا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ اس کا ذکر بھی کیا ہے، اس لیے ان کے لیے اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی تھی- یہاں یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ یہ اعتماد کی فضا تجربے اور مشاہدے پر استوار نہیں ہوئی ہے بلکہ مغرب کی زمین پر ''سر'' کے قدم مبارک کی رنجہ فرمائی اور پھر برٹش حکمرانوں کی طرف توجہات نے دل وفا پیشہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنا قبلۂ عقیدت درست کر کے مغرب کی طرف کر لے-

مذکورہ مثال تحریک سرسید کی پہلی نسل کی ہے، لیکن اس تحریک کے سوا سو سالہ تاریخ کا اگر گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اس نے چار نوعیت کے افراد پیدا کیے ہیں:

(۱) پہلی نوعیت ان افراد کی ہے جنہوں نے معاشی ترقی پا کر اپنے موروثی دین سے قطع تعلق کر لیا اور مکمل طور پر لادینیت سے اپنا رشتہ استوار کر لیا-

(۲) دوسری نوعیت ان کی ہے جو اسلام کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا چاہتے ہیں مگر اپنے مزاج اور سرشت کے مطابق، ایسے افراد اپنی سہولت اور ذاتی فکر کے زیر اثر اسلام کی خود ساختہ توجیہ کرنے لگے اور اسلام کے بے شمار بنیادی موروثی حقائق کا انکار کر بیٹھے- سر دست اس کی واضح مثال ڈاکٹر عارف الاسلام کی کتاب ''اتاترک فی کربلا'' ہے جس میں انہوں نے اپنے ذاتی مزاج کے مطابق علماء دشمنی میں اس حدیث صحیح کا انکار کر دیا جس میں علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا ہے، جس کو بے شمار محدثین نے اپنی مسانید اور سنن میں علی شرط مسلم صحیح کہا ہے، جن احادیث کی کتابوں میں یہ حدیث صحیح مذکور ہے، ان میں چند یہ ہیں: (صحیح ابن حبان، جلد:۱، ص:۲۸۹، سنن ابی داؤد، جلد:۳، ص:۳۱۷، سنن جامع ترمذی، جلد:۵، ص:۴۸، سنن ابن ماجہ، جلد:۱، ص:۸۱، سنن دارمی، جلد:۱، ص:۱۱۰، مسند ابن حنبل، جلد:۵، ص:۱۹۶)

وہ فرماتے ہیں:

(یہ کتاب ناولانہ طرز پر لکھی گئی ہے، اس میں چند حقیقی کردار ہیں جو یونیورسٹی کیمپس میں بیٹھ کر اسلام کے بنیادی نظریات پر احمقانہ تبصرہ اور علماء کے خلاف باتیں کر رہے ہیں، اس میں اقبال کا کردار موصوف کا ہے، گفتگو کے دوران بیرر چائے دینے کے لیے اندر آتا ہے-)

''لیجیے صاحب گرما گرم چائے'' بابو نے تھوڑی ہی دیر میں سب کو چائے دے دی

''تم باہر کیوں چلے گئے تھے؟ اقبال نے اس سے پوچھا

''سچ بتاؤں صاحب'' اس نے جھجھکتے ہوئے پوچھا

''ابے کیا جھوٹ بولے گا؟'' اقبال نے اسے ڈانٹا

''نہیں صاحب! ہمیں بس یہ علماء کے خلاف باتیں اچھی نہیں لگیں- سننے سے بھی کافر ہو جاتا ہے آدمی- اسی لیے ہم باہر چلے گئے'' جواب سن کر اقبال سناٹے میں آ گیا

''اب بول بیٹا، یہ ہے قوم کا فیصلہ- ایک بیئرر تک تمہیں مسلمان نہیں مانتا'' امین نے شرارتی ہنسی ہنستے ہوئے کہا

''سننے والا تک کافر، تو کہنے والا کیا ہوا؟'' شمیر فورا بولا- سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے

''تو کیا میں کافر ہوں تیری نظر میں؟'' اقبال نے مصنوعی غصہ سے پوچھا-

بابو سنی ان سنی کر کے خالی کپ اٹھانے لگا

''اس کی خاموشی ہی جواب ہے'' امین نے پھر اقبال کو چھیڑا

''بابو! جواب دو کھل کر بولو- کیا میں کافر ہوں تمہاری نظر میں؟'' اقبال نے دوبارہ سختی سے پوچھا

''اس دن مسجد میں امام صاحب تقریر کر رہے تھے کہ جہاں کفرانہ بات ہو رہی ہو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے ورنہ ایمان خطرے میں آ جاتا ہے-'' بابو کپ لیجاتے ہوئے بولا

''یہاں کون سی کفرانہ باتیں ہو رہی تھیں؟''

"علماء نائب رسول ہیں صاحب" اس نے رک کر جواب دیا

"ابے نائب رسول کوئی نہیں ہوسکتا، یہ سب ڈھونگ ہے- قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ رسول کا کوئی نائب بھی ہوگا" اقبال کو سچ مچ غصہ آ گیا-

"قرآن آپ کی سمجھ میں آ گیا صاحب؟" اس نے الٹا سوال کیا- اقبال نے اس کے جواب پر سر پیٹ لیا

"یہ یزیدانِ وقت کا چھوڑا ہوا تیر ہے جو مولا کے سینے پر بے خطا نشانہ لگاتا ہے- ہے کوئی جواب؟" فضل حق نے اقبال سے پوچھا

"جاؤ تم باہر جا کر بیٹھو" اقبال نے اسے ڈانٹا

"اس بیچارے پر کیوں غصہ اتار رہے ہو- ہر شاخ پر الو بیٹھا ہے انجام امت کیا ہوگا" امین نے مسکراتے ہوئے کہا

"دنیا کی ہر مسجد میں ملا یہی تقریر کر رہا ہے- ہزار باتیں گنا دیتا ہے جس سے ایمان چلا جاتا ہے، حالانکہ توحید، قیامت، رسالت اور کتاب کے انکار سے ہی بس ایمان جاتا ہے-"

اس پوری گفتگو میں "علماء نائب رسول ہیں" کے بارے میں یہ کہنا کہ قرآن میں کہیں نہیں ہے، واضح طور پر بتا رہا ہے کہ کہنے والا یہ جانتا ہے کہ حدیث میں یہ موجود ہے، جان بوجھ کر حدیث رسول کا انکار ایک مسلمان کو کس دہلیز پر لا کھڑا کر دیتا ہے یہ اگر میں بتاؤں تو انہیں پھر شکوہ ہوگا اس لیے اس کا فیصلہ وہ خود کریں کہ حدیث رسول کے انکار کے بعد وہ اب بھی اپنے مذہب پر قائم ہیں یا نہیں؟ اس ضمن میں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا ہر عالم کی توہین کفر ہے؟ اس کا جواب اسلاف کی معتبر کتابوں میں ملتا ہے کہ ایسا نہیں ہے، اگر کسی عالم کی توہین و تذلیل اگر اس کی گمرہی اور بدعملی کی وجہ سے کی جا رہی ہے تو وہ کفر نہیں ہے، بلکہ اسلام کا مطلوب ہے، ہاں! اگر کسی عالم کی توہین اس کے علم دین یا عالم دین ہونے کی وجہ سے کی جا رہی ہے تو وہ یقیناً کفر ہے، مذکورہ کتاب کے مطالعے کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ پوری کتاب اسی نوعیت کی توہین و تمسخر سے بھری پڑی ہے- اس تمسخر میں

موصوف کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ کہیں کہیں انہوں نے اسلام کے مبادیات کا بھی انکار کر دیا ہے- تحریک سرسید نے اس نوعیت کے بے شمار افراد پیدا کیے ہیں-

(۳) تیسری نوعیت ایسے افراد کی ہے جن کا تعلق اسلام سے اتنا ہی ہے کہ وہ اتفاق سے ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے اور ان کے نام عربی و فارسی میں تھے-

(۴) اور چوتھی نوعیت ایسے لوگوں کی ہے جو خود اپنی ذات میں صحیح اسلام پر عامل ہیں، عقائد کی درستی کے ساتھ عبادات کی پابندی اور شریعت کی پاسداری ان کا وتیرہ ہے-

لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ "خیر امت" ہونے کی جو بشارت قرآن نے ہمیں دی ہے وہ کیا اس بنیاد پر ہے کہ ہم صرف خوش عقیدہ مسلمان رہیں؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے، قرآن کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس اعزاز و منصب کی دو صفتیں ہیں اور وہ ہیں امت محمدی دوسروں کو "نیکی کی تلقین کرتی ہے اور برائیوں پر سرزنش"، اسی بنیاد پر متعلقہ آیت (جو امتیں لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی ہیں تم ان سب میں بہترین امت ہو، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو- ال عمران: ۱۱۰) میں مذکورہ صفتوں کو ایمان پر مقدم کیا گیا، اس لیے کہ انہی دو صفتوں کی وجہ سے مسلمانوں کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے، کیوں کہ ایمان کا دعوی تو دوسری امتیں بھی کرتی رہی ہیں مگر وہ ان صفتوں سے محروم تھیں جن کی وجہ سے وہ نہ خود اپنے اصل دین پر قائم رہ سکیں اور نہ ان کا دین اپنی اصل حالت میں باقی رہا- جبکہ انہیں صفتوں کی بنیاد پر چودہ سو برسوں میں اسلام اپنی حقیقی صورت میں نسلوں میں منتقل ہوتا رہا اور قیامت تک ہوتا رہے گا- اس وضاحت کے بعد اب مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر میں اس فریضہ کو صرف مذہبی تعلیمی تحریک نے پورا کیا ہے جس کی وجہ سے ہمارا ایمان و عقیدہ سلامت رہ سکا-

تحریک سرسید سے استثنائی طور پر چند افراد ایسے بھی ہوئے ہیں جو ان صفتوں کے حامل رہے ہیں، مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے، تاہم واضح رہے کہ اس کی وجہ مذکورہ تحریک نہیں بلکہ ان افراد کا مذہبی، علمی اور روحانی بیک گراؤنڈ رہا ہے یا پھر ان کی اپنی انفرادی فکر جو انہیں خیر امت کی منصبی ذمہ داری کی انجام دہی پر اکساتی رہی-

اسلام کی ترقی یہ ہے کہ وہ اپنے حقیقی صورت کے ساتھ سمتوں میں پھیلتا رہے اور معاشرہ اپنے مذہبی وشرعی اقدار ونظریات پر عامل رہے، تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ اس ترقی کے نتائج ہمہ گیر ہوتے ہیں، جب اسلام ترقی کرتا ہے تو پھر معاشرے میں علمی، فکری، اخلاقی، سائنسی، روحانی اور معاشی ترقی ہوتی ہے- معاشی ترقی کی ایک مثال شہر مدینہ ہے جب وہاں کا معاشرہ مکمل طور پر اسلامی نظریات پر عامل ہوگیا تو ایک دور وہ بھی آیا کہ وہاں کوئی مفلس نہیں رہا کہ وہ زکوۃ لے سکے اور یہی اسلام جب ترقی کرتا ہوا اسپین تک پہنچا تو علمی، فکری، سائنسی اور معاشی ترقی میں اپنی آٹھ سو سالہ فتوحات کا زریں باب لکھ دیا-

اسپین میں مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ سیاسی اقتدار ۱۴۹۲ء میں جب ختم ہوا تو ایسا نہیں تھا کہ مسلمانوں کا وجود وہاں سے مٹ گیا بلکہ جو ہوا وہ یہ کہ مسلمانوں سے علم دین کا تسلسل ختم ہوگیا- مسلم اسپین میں سائنسی اور مذہبی علوم دونوں کا بہت فروغ ہوا، کیوں کہ اشاعت دین اور تعلیم وتدریس کا سارا کام حکومت کی سرپرستی میں انجام پا رہا تھا، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اسپین کی صد فی صد آبادی تعلیم یافتہ ہوگئی، جب مسلمانوں کا یہ سیاسی اقتدار غروب ہوا تو اس کے ساتھ تعلیمی نظام بھی ختم ہوگیا- اسپین میں عیسائی حکومت آنے کے بعد استثنائی طور پر سیکولر علوم وفنون کے ادارے تو چلتے رہے لیکن مذہبی علوم اور ان کی تدریس کے دینی مراکز ختم کر دیے گئے، اس طرح مسلمانوں کا رشتہ اپنے مذہب سے ختم ہوگیا، یہاں تک کہ مذہبی تعلیم سے نسل در نسل انقطاع کے نتیجے میں وہ اپنی دینی ومذہبی شناخت کھو بیٹھے اور اسپین کے مقامی معاشرے میں اس طرح ضم ہوگئے کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ان کے آباء واجداد کبھی مسلمان تھے-

۱۸۵۷ء کے بعد یہی حالت متحدہ ہندوستان کی تھی، یہاں بھی برٹش حکومت مکمل اقتدار حاصل کرنے کے بعد لارڈ میکالے کی اسکیم کے تحت سیکولر علوم کو فروغ دے رہی تھی، جو تحریک سرسید بھی تھی، اور مذہبی علوم کو مٹانے کی پوری کوشش میں تھی، مگر ہندوستان میں علماء انفرادی طور پر اس چیلنج کا جواب بن گئے، جبکہ اسپین میں یہ مواقع میسر نہیں ہوسکے- آج بھی وہاں سیکولر علوم کی تدریس کے بے شمار ادارے ہیں مگر جن اداروں سے اسلام سمتوں

میں پھیلتا ہے اور اس کی فکر معاشرے کو صالحیت پر اصرار کرتی ہے، اس کا فقدان ہے، جس کے نتیجے میں وہاں کے غالب مسلمان تعلیمی وقانونی فارموں کو پر کرتے وقت اپنے نام غلام رسول، نظام الدین، وجیہ الدین، عبداللہ اور فضل رسول اور مذہب کے خانے میں اسلام لکھتے ہیں مگر نظریاتی اور عملی حیثیت سے ان کے مفاہیم سے نا آشنا ہیں-

بیسویں صدی کے اٹھویں دہائی میں ہندوستان کے معروف عالم علامہ ارشد القادری (۱۹۲۵ء/۲۰۰۲ء) نے ہالینڈ میں ایک دینی ادارہ بنام جامعہ مدینۃ الاسلام قائم کیا اور اس کے افتتاحی اجلاس میں جو خطبہ پڑھا تھا وہ اسی تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ تھا:

> ’’اسپین جو ہمارے پڑوس کا ملک ہے، وہاں آٹھ سو برس تک ہماری حکومت رہی، وہاں جب انقلاب کے بعد نئی حکومت نے مسلمانوں کو مٹانا چاہا تو انہوں نے صرف اتنا کیا کہ پورے ملک میں دینی تعلیم کے حصول کے دروازے مقفل کر دیے- درسگاہوں سے مسلم سوسائٹی کا رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد ایک صدی نہیں گزری کہ پورے ملک میں مسلمانوں کا نام ونشان مٹ گیا، آج بھی مسجدوں کے بلند مینارے موجود ہیں جو ہماری عظمت رفتہ کا خطبہ پڑھتے ہیں، آج بھی وہاں خانقاہوں کی پرشکوہ عمارتیں کھڑی ہیں جو لوگوں کو ہماری روحانی امنگوں کی روداد سناتی ہیں، لیکن صرف ایک دینی تعلیم گاہ اجڑ جانے کے نتیجے میں پورا ملک مسلمانوں سے خالی ہوگیا-‘‘

(خطبات استقبالیہ، ص:۶۳)

تاریخ اسلام کے مصنف مولانا اکبر نجیب آبادی نے بھی اسپین میں مسلمانوں کی بد حالی کی وجہ یہی بیان کی ہے:

> ’’مسلمان جب کبھی اور جہاں کہیں دین اسلام سے ایسے غافل اور قرآن کریم سے بے تعلق ہوئے ان پر ایسی ہی مصیبتیں نازل ہوئی ہیں-‘‘

(حصہ: سوم، ص:۲۶۶)

یہاں ضمنی حیثیت سے ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ کیا اس مذہبی تعلیمی تحریک کے نتیجے

میں پیدا ہونے والے علماء قول وعمل کے اعتبار سے صد فی صد صحیح ہوتے ہیں؟ اور اپنے مذہبی فریضے کو اسلام کے مطلوبہ طریقے پر انجام دیتے ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا، کیونکہ انسان کا کوئی بھی طبقہ صد فی صد درست ہو جائے یہ ممکن نہیں، یہ بات تو عارف الاسلام صاحب اور ان دانشوروں کو سمجھنی چاہیے جو ہر عالم کا رشتۂ نسب فرشتوں میں تلاش کرتے ہیں اور ہر عالم میں رازی وغزالی کی صلاحیتوں کو دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں- علماء کی حقیقی صلاحیتوں اور ان کے کارناموں کا غیر جانب دار مطالعہ کرنا ہو تو ''فرق مراتب'' کا خیال رکھنا ہی ہوگا کہ ایک مسجد کا امام اور معمار ملت یا شیخ الاسلام برابر نہیں ہوسکتے، جس طرح عصری علوم پاکر ایک کلرک اور ایک پروفیسر برابر نہیں ہوتے- اگر ہم ایک کلرک سے سرسید جیسی تحریک کی توقع نہیں رکھتے تو پھر ہر ایک امام یا ہر معمولی صلاحیت کے عالم سے تجدید واحیائے دین کی لو کیوں لگاتے ہیں؟

اس فرق مراتب کا جب بھی خیال نہیں رکھا جائے گا ''اتاترک فی کربلا'' جیسی کتابیں وجود میں آتی رہیں گی، تاریخی حقائق پامال ہوتے رہیں گے اور زندیقیت اپنے پاؤں پسارنے کو بے تاب رہے گی-

تحریک سرسید تو ایک مثال ہے، پچھلی کئی دہائیوں سے مسلمانوں کی یہ عمومی سوچ ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کی ترقی سے اسلام کی ترقی ہوئی ہے حالانکہ یہ ایک غلط مفروضہ تھا جو کبھی واقعہ نہ بن سکا- اس ضمن میں ایسا ہوسکتا ہے کہ کسی مسلمان کی ترقی سے بالواسطہ اسلام کو فائدہ پہنچا ہو، مگر ایسی شاذ ونادر مثالوں سے ایک عمومی اور اجتماعی مفروضہ قائم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ایسا بالواسطہ فائدہ کسی منفی عمل کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے، مگر اس شاذ بنیاد پر منفی اعمال کو ترقی ورواج دینے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، اس کی واضح مثال ۹/۱۱ کا سانحہ ہے، اس منفی عمل سے مغرب میں اسلام کو بہت فائدہ پہنچا ہے، اس منفی عمل کے بعد اسلام پر جس طرح کے بحث ومباحثہ کا دروازہ کھلا اور عام لوگوں کو اسلام کے بارے میں براہ راست جاننے کا شوق ہوا، اس نے بے شمار افراد کے دلوں میں اسلام کے لیے ہمدردی پیدا کی اور بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا-

مسلمان کی ترقی سے اسلام کی ترقی لازم نہیں لیکن اسلام کی ترقی سے مسلمان کی ہمہ جہت ترقی یقینی ہے، امت مسلمہ اگر اپنی ہمہ جہت ترقی کی طالب ہے تو اسے پہلے اسلام کی ترقی کے دروازے کھولنے ہوں گے ورنہ وہ خود صرف معاشی وسیاسی ترقی کرتی رہے گی اور مذہبی، تہذیبی، فکری اور اخلاقی قدریں معاشرے سے مٹتی چلی جائیں گی اور مسلمان مغربی قوموں کی طرح حیوان کاسب بن کر رہ جائے گا-

❑❑❑

حقوق انسانی کے دو عالمی منشور: ایک موازنہ

یہ حقیقت ہے کہ انسانوں کے بیچ خود انسان کی خودساختہ طبقاتی تقسیم نے ہمیشہ سے انہیں دو خانوں کمزور اور طاقتور میں بانٹے رکھا- اب دنیا میں انسان کے ان دو طبقوں (طاقت ور اور کمزور) کے درمیان اعتدال اور توازن قائم رکھنے کے لیے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں کہ طاقت ور اپنی قوت کا غلط اور ناجائز استعمال نہ کرے بلکہ اپنی طاقت سے کمزوروں کی کمزوری دور کرے، ان کا سہارا بنے، ان کی دستگیری اور دلجوئی کرے-لیکن اقوام عالم کی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے فطرت کے اس تقاضے کو کبھی پورا نہیں کیا، طاقت ور کو بے شمار حقوق مل گئے اور کمزور کو حقوق واختیارات کم سے کم ملے یا ملے ہی نہیں-انسان کے اس غیر متوازن طرز عمل نے زمین کی وسعتوں میں اصحاب حقوق وفرائض کے مختلف طبقات کو جنم دیا-

ایک طبقہ دنیا کے تمام وسائل پر قابض ہے اور تمام ذرائع اسی کی ملکیت میں ہیں جب کہ دوسرا طبقہ بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہے-ایک طرف عیش وعشرت کے تمام ساز و سامان ہیں، دوسری طرف انسانیت اپنے وجود کی بقا کے لیے بھی تڑپ رہی ہے- یہ تو ماضی کا آئینہ تھا، حال کا مشاہدہ بھی اس سے دگرگوں نہیں ہے- آج بھی طاقت ور کے ہاتھوں میں حکومت ہے، قانون ہے، مراعات ہے، حقوق ہیں، معیشت ہے اور تعلیم ہے، جب کہ کمزور کے دماغ میں ان چیزوں کا تصور بھی گناہ ہے- وہ زندہ بھی ہے طاقت وروں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے- انسان کے درمیان اس طبقاتی تقسیم کے عدم توازن کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ دونوں طبقوں نے اس عدم توازن، حقوق سلبی اور انارکی کو فطرت کا قانون سمجھ لیا- طاقت ور

نے تمام حقوق ومراعات اور اختیارات کو اپنا پیدائشی اور ذاتی حق سمجھا اور کمزور اپنی کمزوری، محرومی اور پستی کو اپنی قسمت- اس عدم توازن کے نتیجے میں دونوں طبقوں کے درمیان بارہا جھڑپیں ہوئیں، بغاوتیں بھی ہوئیں مگر اس تصادم کا کوئی موثر نتیجہ نہیں نکلا- آخر چند صدیاں قبل جب انسان مختلف تعلیم وتہذیب سے آشنا ہوا اور اس کا شعور بیدار ہوا تو اس کے ذہن میں حقوق انسانی کا تصور ابھرا اور پھر اس کے لیے جدوجہد شروع ہوگئی- بہت جلد اس جدوجہد نے عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کا مرکز یورپ میں برطانیہ اور فرانس ہوئے اور پھر امریکہ ہوا-

یہ بھی وقت کا ایک عجیب المیہ ہے کہ مہذب کہلانے والی قوم ایک عرصے تک کمزوروں کے حقوق سلب کرتی رہی، انہیں زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم کرتی اور کچلتی رہی، مگر جب اس نے ہوش سنبھالا تو مختلف ادوار میں اپنی فکر، اپنی عقل اور اپنی ذہنی سطح کے حساب سے انسانی حقوق متعین کر لیے کہ یہ ہیومن رائٹس ہیں، پھر اپنا ایک خودساختہ سانچہ بنالیا اور اسی کو معیار حق تسلیم کر لیا اور پھر اس پر پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ کے ذریعے دیے گئے انسانی حقوق کے صدیوں پرانے، آفاقی اور عملی تصور کو آنکا جانے لگا- جو تصور نہ کبھی زمانے کے بدلتے دھارے میں فرسودہ ہوا، نہ حالات کے مختلف ادوار میں اس تصور میں تبدیلی کی ضرورت پڑی، یہ طرف داری نہیں حقیقت کا اعتراف ہے- اسی تصور سے پیغمبر اسلام نے جزیرۂ نما عرب کے طوائف الملوکانہ مزاج میں، جہاں معمولی باتوں پر خانہ بدوش قبیلوں کے درمیان برسوں لاحاصل جنگیں ہوا کرتی تھیں، صرف دس سال کی چھوٹی مدت میں بارہ لاکھ مربع میل میں ایک ایسی مستحکم اور بڑی مملکت قائم کر دی جس نے پورے جزیرۂ عرب کو وحدت، اخوت، مساوات، اور محبت کی ایک لڑی میں پرو کر رکھ دیا- آج بھی حقوق انسانی کے سلسلے میں آپ کی ہدایتیں ایک متوازن، خوشحال، تعلیم یافتہ، مہذب اور پرسکون ریاست کی ضمانت دیتی ہیں- اس کے برخلاف انسانیت کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو انسانی حقوق کی بحالی کے لیے صدیوں تک مختلف کوششیں ہوتی رہیں، لیکن آج بھی وہ ان کوششوں کے نتیجے میں دنیا کو ان کے جائز اور بنیادی حقوق فراہم نہ کر سکے، آج انسانیت کے درمیان طبقاتی

کشمکش اپنے عروج پر ہے، طاقت ور کے پاس سارے حقوق ہیں تو کمزور بنیادی حقوق سے محروم۔

حقوق انسانی کی بحالی کے لیے بتدریج جدوجہد:-

- نئے عہد کے مؤرخین کا خیال ہے کہ دنیا حقوق انسانی کے تصور سے Magna Carta (منشور اعظم) کے ذریعہ آشنا ہوئی، یہ شاہ برطانیہ جون John کے عہد میں ۱۵؍جون ۱۲۱۵ء میں منظور ہوا۔ یہ منشور درحقیقت بادشاہ سے بعض طبقات کے حقوق پر غور کرنے کی اپیل تھی، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔
- یورپ و امریکہ میں اس سلسلے میں مزید کوششیں ہوئیں اور شاہ کانکرڈ ثانی Concard II نے ایک منشور کے ذریعہ پارلیمنٹ کے اختیارات متعین کیے۔
- ۱۷۶۲ء میں فرانس کے معروف مفکر روسو Rousseaue نے معاہدۂ عمرانی لکھا، اسے انقلاب فرانس کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ۱۷۸۹ء میں فرانس کا منشور حقوق انسانی Declaration of the Rights of Man سامنے آیا۔
- ۱۷۷۶ء میں امریکی ریاست ورجینا میں منعقدہ اجتماع نے George Mosion کا مرتب کردہ منشور حقوق انسانی منظور کیا۔
- حقوق انسانی کے سلسلے میں مزید غور وفکر ہوتا رہا، یہاں تک کہ ۱۸۹۸ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک صرف دس سالوں میں حقوق انسانی کے تعین اور اس کی بحالی کے لیے تین عالمی کانفرنسیں منعقد ہوئیں (۱) برلن کانفرنس (۲) بروسیل کانفرنس (۳) ہیگ کانفرنس۔
- اس سلسلے میں اہم موڑ ۱۹۴۱ء میں آیا جب امریکی صدر روز ویلٹ اور برطانوی وزیر اعظم چرچل کے طویل مذاکرے کے نتیجے میں انسانی حقوق کی بحالی کے لیے ایک جامع منشور مرتب کرنے پر زور دیا گیا اور اس کا نام اٹلانٹک چارٹرس Atlantic Charters رکھا گیا۔
- ۱۹۴۴ء میں موسکو میں کئی ممالک پر مشتمل ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد ہوا، جس کے

نتیجے میں میں موسکو ڈیلریشن Moscow Declaration سامنے آیا۔

- ۱۹۴۶ء میں سان فرانسسکو امریکہ میں ایک عالمی کانفرنس ہوئی جس میں انسانی حقوق کی بحالی کے لیے ایک بلیو پرنٹ تیار کیا گیا جسے Sanfrancisco Blue Print کہا گیا۔
- اقوام متحدہ نے بھی حقوق انسانی کی تعیین اور اس کی بحالی کے لیے مختلف قرار دیں منظور کیں، آخر ۱۰؍دسمبر ۱۹۴۸ء کو اس نے The Universal Declaration of Human Rights کے نام سے ایک عالمی حقوق انسانی منشور پاس کیا۔ یہ اس سلسلے کی آخری اور فائنل کوشش تھی۔ دنیا کی اکثریت نے اس منشور کی تائید کی اور جنہوں نے تائید نہیں کی تو اس سے اختلاف بھی نہیں رکھا، یہاں تک کہ اسے انسانی تاریخ میں ایک انتہائی کامیاب اور انقلابی قدم تسلیم کرلیا گیا۔

اقوام متحدہ کے اس آفاقی اعلامیہ (Universal Declration) میں تیس دفعات ہیں، جنہیں انسانی تاریخ کا ایک انقلابی قدم مانا گیا ہے۔ یہ تیس دفعات اس اعلامیہ کو مرتب کرنے اور پاس کرنے والوں کے لیے انقلاب آفریں اور نئی چیز تھی مگر جو لوگ اسلامی تاریخ سے واقف ہیں انھیں معلوم ہوگا کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے آج سے پندرہ سو برس پہلے جب دنیا جہالت اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، نہ علوم وفنون مدون ہوئے تھے، نہ تعلیم و ثقافت سے آشنائی تھی اور نہ دنیا نے سائنسی اختراعات کی حیران کن بلندیوں کو چھوا تھا، حقوق انسانی کا ایک جامع دستور پیش کیا بلکہ اسے نافذ کر کے دکھایا۔ آج جب ہم اقوام متحدہ کی دفعات کا جائزہ لیں تو کاغذوں پر ان حقوق کے مطالبات بھلے معلوم ہوتے ہیں لیکن جب نفاذ کی بات آتی ہے تو سوسائٹی پر ان کے نتائج نہایت منفی مرتب ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے مذکورہ حقوق انسانی منشور میں ان ہی جیسی دیگر بہت سی خامیوں کی وجہ سے ہی آج تک عملی طور پر یہ کامیاب نہ ہوسکا۔

مغربی ماہر قانون Hens Calsan نے اس یونیورسل ڈکلریشن پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

''اس کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں انسانی حقوق تو بیان کر دیئے گئے لیکن یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ کوئی شخص ان حقوق کو توڑے تو اس کی سزا کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس میں آج تک حقوق کی پامالی ہو رہی ہے- میرے نزدیک دراصل یہ Promotional law ہے Operational نہیں، یعنی ہم ان انسانی حقوق کے قوانین کی صرف سفارش کر سکتے ہیں، اس میں قوت نفاذ نہیں''-

اس مختصر مگر نہایت جامع تبصرے سے مذکورہ منشور کی بنیادی خامی کا اندازہ ہوتا ہے- اس کے علاوہ انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ سچائی بھی سامنے آتی ہے کہ انسانی حقوق کا پیمانہ اور معیار ہر دور میں بدلتا رہا ہے، کسی دور میں کسی جگہ ایک حق کو صحیح قرار دیا گیا، پھر اس حق کو معیار تسلیم کر لینے کے بعد دنیا نے اس کی تشہیر میں کوئی کسر نہیں چھوڑی- اس حق کی ادائیگی کے لیے شور مچایا گیا اور اس سے انحراف کو جرم تسلیم کیا گیا- مگر دوسرے دور میں اسی حق کو دوسری جگہ ناحق مان لیا گیا- انسانی حقوق کے سلسلے میں دنیا خصوصاً مغرب کے اس دوہرے اور متضاد رویے سے تاریخ بھری پڑی ہے- اسے صرف اس ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے-

پیغمبر اسلام ﷺ کے عہد میں انسانی حقوق کے حوالے سے غلامی کا تصور بڑا عجیب تھا اور اسی تصور کو معیار حق تسلیم کیا جاتا تھا کہ جب ایک شخص کسی کی غلامی میں چلا گیا تو نہ صرف یہ کہ اپنے جان و مال اور جسم پر بھی اس کا اختیار ختم ہو جاتا تھا، بلکہ اسے انسانی حقوق اور انسانی مفادات کے ہر تصور سے عاری سمجھا جاتا تھا- اس دور میں آقا کا یہ بنیادی حق تھا کہ وہ غلام کی گردن پر اپنی غلامی کا پٹہ ڈال دے-

یہ تو دور جاہلیت کا تصور تھا- وقت نے کروٹ لی اور دنیا نے اسے ناحق قرار دیا، لیکن ابھی سوا ڈیڑھ سو سال قبل جرمنی اور اٹلی میں فاشزم اور نازی ازم نے سر ابھارا، جس میں انہوں نے یہ تصور پیش کیا کہ طاقت ور کا کمزور پر حکومت کرنا اس کا بنیادی حق ہے اور کمزور پر واجب ہے کہ وہ طاقت ور کے سامنے سر جھکا دے- پھر حالات نے پلٹا کھایا اور اب اس

تحریک اور اس تصور کو ایک گالی سمجھا جا رہا ہے-

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسانی حقوق کے تصورات ہمیشہ یکساں نہیں رہے اور نہ رہنے کا کوئی امکان ہے- آج جن حقوق کو اقوام متحدہ کے ذریعے انقلابی بتا کر ان کی تشہیر کی جا رہی ہے، اس کی کیا ضمانت ہے کہ کل وہ تبدیل نہیں ہوں گے؟

اس کے برخلاف اسلام نے انسانی حقوق کے تعین کی ایسی بنیاد فراہم کر دی ہے کہ جس پر فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ کن حقوق کا تحفظ ہونا چاہیے اور کن حقوق کا نہیں، آج اس اساس کو تسلیم کرنا دنیا کی مجبوری بنتی جا رہی ہے- صدیوں سے انسانی حقوق کے تعین کی جتنی بنیادیں فراہم کی گئیں، وہ انسانی عقل، انسانی فکر اور سوچ کی اُپج تھیں جس کی پرواز محدود، جس کا علم محیط، اور جس کی عقل محصور، لیکن پیغمبر اسلام کے ذریعے جو اساس دنیا کو دی گئی، وہ اس ذات کی عطا تھی جس نے پوری کائنات اور انسانوں کو پیدا فرمایا- یہی وجہ تھی کہ انسانی حقوق کی یہ اساس زمین و مکان کے تغیر کے اثرات سے بے نیاز ہو گئی-

حقوق انسانی کے دو عالمی منشور: ایک موازنہ:- اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے اس عالمی منشور میں فرد کی آزادی، عدل و انصاف اور مساوات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے- یہ منشور معاشی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی حقوق کے ساتھ سیاسی حقوق کا بھی احاطہ کرتا ہے- ذیل میں ہم ان ۳۰/دفعات میں سے چند کا پیغمبر اسلام ﷺ کے ذریعے دیے گئے منشور برائے حقوق انسانی سے موازنہ کرتے ہیں-

(۱) اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۴ میں ہے کہ ''کسی شخص کو غلام نہیں بنایا جا سکتا''-

عالمی برادری نے یہ دستور تو بنا دیا مگر ان کے طاقتوروں نے آج بھی کمزور قوموں اور ملکوں کو اپنا ذہنی، معاشی اور سیاسی غلام بنا کر رکھا ہوا ہے- ان کے شب و روز اسی پالیسی کو مستحکم کرنے میں صرف ہو رہے ہیں کہ دنیا کو صارفیت اور تہذیب کے ذریعے اپنا غلام کیسے بنایا جائے، طاقتور ملکوں کی سپر پاور بننے کی دوڑ میں حصہ داری اسی جنونی تصور کا نتیجہ ہے- آج ان دستور کے مرتبین کا میڈیا کے ذریعے اسلامی نظریات کو سبوتاژ کرنے کی کوشش،

فیشن کے نام پر اپنی تہذیب کو دنیا پر مسلط کرنے کا جنون، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے عالمی معیشت پر قابض ہونے کی جدوجہد اسی تصور حکمرانی کا شاخسانہ ہے-اب دوسری طرف انسان کے سلسلے میں پیغمبر اسلام کے تصور آزادی کی طرف دیکھا جائے تو وہاں قول وعمل کا کوئی تضاد نظر نہیں آتا-انہوں نے اگر انسان کے سب سے اہم حق،حق آزادی کا تصور دیا، غلاموں کے خلاف جابرانہ برتاؤ سے منع کیا، مالکوں کے بے رحمانہ سلوک کو کالعدم قرار دیا ،غلاموں کو آزاد کرنے کو نیکی بتایا اور آزاد کو غلام بنانے کی مذمت کی تو ان اقوال پر اپنی پوری زندگی عملی مظاہرہ کر کے دنیا کو دعوت فکر وعمل بھی دی، وہ بھی ایسے وقت میں جب غلامی کا تصور اور ان کے ساتھ جانورانہ برتاؤ کو معیار حق سمجھا جاتا تھا-ایسے ماحول میں آپ نے صراحتاً فرمایا کہ:

''اللہ تعالیٰ تین آدمیوں کی نمازیں قبول نہیں کرتا، ان میں سے ایک ہے **ورجل اعتبد محررہ** -''وہ شخص جس نے اپنے آزاد کردہ غلام کو پھر سے غلام بنالیا-''(ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ)

آپ فرماتے ہیں کہ''غلام کو غلام کہہ کر نہ پکارا جائے، کیوں کہ اس کے اور مالک کے درمیان برادرانہ، پسرانہ یا دخترانہ رشتہ ہوتا ہے''-آپ نے مزید فرمایا کہ''وہ جنہیں تم نوکر کہتے ہو تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارا معاون بنایا ہے''-آپ مزید فرماتے ہیں کہ''انہیں نوکر کہہ کر ان کے احساسات کو مجروح نہ کیا جائے بلکہ انہیں اے میرے بچے کہہ کر بلاؤ''-

یونانی فلسفی ارسطو غلاموں کو روحوں والی مشین تصور کرتا تھا، جب کہ پیغمبر اسلام نے ایک انسان کی حیثیت سے غلاموں کو وقار بخشا اور فرمایا کہ''ان کے اندر بھی تمہاری ہی جیسی روح پائی جاتی ہے''-اوران غلاموں کو اسلامی سماج اور اسلامی خاندان کا ایک فرد قرار دے کر ان کی سماجی حیثیت کو بہت بلند کر دیا-رسول کریم ﷺ نے ایک غلام زید کو اپنا بنایا اور پھر اسے آزاد کرایا، جب حضرت زید کے والدین کو ان کی آزادی کی خبر ملی تو وہ آپ کے پاس آئے کہ زید کو واپس لے جائیں لیکن حضرت زید نے والدین کے ساتھ جانے سے

انکار کر دیا اور پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ ہی رہنا پسند کیا، کیوں کہ ان کے اور آپ کے خاندان کے دوسرے افراد کے درمیان کوئی تفریق نہیں تھی-

پیغمبر اسلام نے غلاموں کو خاندان کے افراد کی حیثیت سے قبول کرنے اور نئی سوسائٹی میں ضم کرنے کے لیے انہیں شادی، قرابت داری اور سماجی وحدت کا حق بھی فراہم کیا اور انسانی وقار کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے باندیوں کی غلامانہ زندگی پر پابندی لگا دی-قرآن کہتا ہے کہ''تم سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہاری لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کا نکاح کرو، اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے گا''-

رسول کریم کی یہ تمام کارروائیاں صرف اس لیے تھیں کہ غلامی کے عمل کو بتدریج ختم کر دیا جائے-ایسے میں بتایا جائے کہ انسانی تاریخ کا انقلابی قدم کون سا تھا؟ وہ جہاں قول و عمل میں عرش وفرش کا تضاد تھا اور ہے یا وہاں جہاں اس تصور اور خواب کو زمین پر اتار کر شرمندہ تعبیر کر دیا گیا؟

(۲) عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۷ میں ہے کہ'' قانون کی نگاہ میں ہر شخص برابر ہے''-اور آرٹیکل نمبر ۸ میں ہے کہ''ہر شخص کو اپنے اوپر ہوئے ظلم کے خلاف عدالت میں جانے کا اختیار ہے''-

لیکن یہ قوانین اور حقوق بھی صرف منشور کی زینت کے لیے ہیں، دنیا میں ان حقوق کے نفاذ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی-دور کیوں جایئے انسانی حقوق کی ان دفعات کی حیثیت اس حقیقت سے دو کوڑی کی رہ جاتی ہے کہ برطانیہ میں آج بھی کوئن آف ویلز اور شاہی خاندان (Royal Family) کے خلاف برطانیہ کی کسی بھی عدالت میں کوئی مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا-

برطانیہ اور امریکہ نے برسوں سے ہزاروں بے گناہ افراد کو سیاسی قیدی بنا کر گوانتانا موبے اور ابوغریب جیل میں قید کر رکھا ہے اور ان پر ظلم و بربریت کی ساری حدیں ختم کر دی ہیں مگر ان میں سے آج تک کسی بھی فرد کو اپنے اوپر ہوئے ظلم کے خلاف کسی بھی عدالت میں صفائی دینے کا موقع نہیں دیا گیا-

دوسری طرف پیغمبر اسلام کا انسانی حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں مقدس کردار ملاحظہ فرمائیں جس کی مثال دنیا کا کوئی بھی منشور دینے سے قاصر ہے۔عہد رسالت میں ایک معزز قبیلے کی عورت پر چوری کا الزام ثابت ہو جاتا ہے، حضرت سرور کونین ﷺ اسلامی قانون کے تحت اس جرم کے پاداش میں اس عورت کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم جاری فرماتے ہیں۔اس حکم سے سوسائٹی میں سراسیمگی پھیل جاتی ہے کہ ایک بڑے خاندان کی عورت بھی اسلامی قانون سے بالاتر نہیں، کچھ لوگوں نے چاہا کہ اس عورت کی سزا معاف کر دی جائے کیوں کہ وہ ایک معزز قبیلے سے تعلق رکھتی ہے، لوگوں کے کہنے پر حضرت اسامہ بن زید جو آنحضرت سے کافی قربت رکھتے تھے، بارگاہ رسول میں حاضر ہوئے اور اس عورت کے حق میں سفارش کی۔حضور نے ان کی سفارش کو سنتے ہی فرمایا:

أتشفع في حدود الله يا اسامه! لو كانت فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها (اے اسامہ! تم اللہ کے حدود میں رعایت کی بات کرتے ہو؟ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ نے چوری کی ہوتی جب بھی میں ضرور اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا)

یہ تو فاطمہ بنت محمد (ﷺ) کی بات تھی، خود شارع اسلام نے اپنے آپ کو قانون سے ماورا نہیں سمجھا اور لوگوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ ان کے خلاف کوئی مقدمہ پیش کرنا چاہتے ہوں تو انہیں اس کا پورا حق ہے۔چنانچہ آپ کی ظاہری حیات کے آخری ایام ہیں، ایسے میں آپ اعلان فرماتے ہیں کہ اگر مجھ سے تمہارے حق میں کوئی زیادتی ہوگئی ہو تو وہ بلا تردد سامنے آئے اور اپنا بدلہ لے لے، ایک شخص سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ اے اللہ کے رسول! ایک مرتبہ جب آپ جہاد کے لیے صف بندی فرما رہے تھے تو آپ کے عصا سے میرے سینے پر چوٹ لگ گئی تھی۔حضرت سرور کونین ﷺ نے فوراً اپنی قمیص اپنے جسم اطہر سے اوپر اٹھا دی اور فرمایا کہ تم بھی اپنے عصا سے میرے سینے میں اتنی ہی تیز ضرب لگاؤ جتنی تمہیں لگی تھی۔

عدل وانصاف اور مساوات کی اس سے بہتر مثال اور انسانی حقوق کی ادائیگی کی اس سے احسن تبلیغ کا کوئی فارمولہ کسی منشور میں نہیں پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۳) عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۱۶ر میں ہے کہ ’’جب لڑکا اور لڑکی بالغ ہو جائیں تو انہیں کسی قوم، ملک اور مذہب کی حد بندی کے بغیر شادی کرنے کا حق ہے‘‘۔اس منشور میں شادی ایک Civil contract دیوانی معاہدہ، یعنی ایک شخص کا ذاتی معاملہ ہے، خواہ شادی کرے یہ نہ کرے، لیکن اگر کرے تو کیسے کرے؟ اور نہ کرے تو کن صورتوں میں نہ کرے اور اہلیت کے باوجود نہ کرے اور گناہ کرتا رہے تو اس کی سزا کیا ہے؟ پھر اگر اس دیوانی معاہدہ کو کسی نزاع کے سبب ختم کرنا چاہے تو اس کی کیا صورتیں ہوں گی؟ اس دفعہ میں ان تمام بنیادی سوالوں کا جواب نہ ہونے کے باوجود دنیا اسے انقلابی قدم مانتی ہے۔

جن لوگوں کی نظر اسلامی قوانین پر ہے وہ جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے آج سے صدیوں پہلے نکاح کا جو جامع اصول مرتب کر کے دنیا کو دیا، اس میں مذکورہ تمام سوالوں کا جواب بھی مل جاتا ہے۔شریعت کے نزدیک نکاح کا مقصد صرف تلذذ نفس اور افزائش نسل نہیں بلکہ نکاح شرعی اصولوں پر کیا گیا ایک ایسا معاہدہ ہے جس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے ساتھ جنسی تعلق جائز اور پیدا ہونے والی اولاد کا نسب شرعاً ثابت ہو جاتا ہے اور شوہر و بیوی پر ایک دوسرے کے حقوق وفرائض عائد ہو جاتے ہیں۔اسلام نے عقد نکاح کا مقصد اتنا ہمہ جہت اور بامقصد پیش کیا ہے کہ دنیا کا کوئی دستور اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔شریعت میں نکاح کا مقصد جہاں نسل انسانی کی بقا ہے، وہاں عفت وعصمت کی محافظت، آپسی الفت ومحبت، سکون کا حصول، اللہ ورسول کے احکام کی تعمیل اور حرام کاری سے اجتناب بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ شرعاً نکاح ایک دیوانی معاہدہ نہیں بلکہ عبادت ہے، اس لیے حضرت محمد رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا: **النكاح من سنتي فمن رغب عن سنتي فليس مني** (نکاح میری سنت ہے تو جس نے اس سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں) یعنی نکاح کی اہلیت اور حرام کاری کے اندیشے کے باوجود کوئی نکاح نہیں کرتا تو وہ مجھ سے نہیں۔

اگر نکاح کے شرعی معاہدے کے بعد وہ مقصد حاصل نہیں ہو پا رہا ہے، یعنی زوجین کی زندگی سکون سے نہیں گزر رہی ہے، آپسی الفت ومحبت کا فقدان ہے اور ان کے لیے حدود اللہ کو قائم رکھنا دشوار ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں اس معاہدے کو احسن طریقے سے ختم

کرنے کے کئی جامع طریقے آپ نے انسانوں کو دیے تا کہ معاشرے اور فیملی میں فساد برپا نہ ہو، معاہدے کے ختم ہونے کے بعد عورت اور بچوں کا مستقبل برباد نہ ہو اور مرد کا سکون غارت نہ ہو- انسانی حقوق کے سلسلے میں اور کوئی منشور دنیا کے سامنے اس سے بہتر رشتۂ ازدواج کا تصور پیش کرسکتا ہے؟

(۴) عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۱۷ میں ہے کہ ''ہر شخص کو حق ملکیت ہے''- مساوات کو انسان کا بنیادی حق ہی نہیں بلکہ تمام حقوق کی اساس تسلیم کیا جاتا ہے- اقوام متحدہ کے عالمی منشور The Universal Declaration of Human Rights میں جتنے حقوق کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ حقوق تمام لوگوں کے لیے یکساں ہیں- اس میں رنگ، نسل، جنس (مرد وعورت)، مذہب، زبان، سیاسی، سماجی، معاشی اور ملکی حیثیت کی بنیاد پر کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا جائے، یہی بات بین الاقوامی سیاسی و سماجی معاہدہ International Convenant in Civil Political Rights میں بھی کہی گئی ہے-

ان تمام خوش کن دعووں کے باوجود کیا اس حقیقت سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کے بیشتر حصوں میں رنگ ونسل، زبان، جنس و مذہب اور سماجی وملکی حیثیت کی بنیاد پر لوگوں میں امتیازی سلوک روا رکھا جارہا ہے- آج خود امریکی اور برطانوی شہریوں کو نمبر ایک کا شہری سمجھا جاتا ہے، جب کہ ایشیائی ممالک سے تعلق رکھنے والوں کو نمبر دو کا- یورپ وامریکہ میں امریکیوں اور یورپیوں کو جو حقوق ومراعات حاصل ہیں وہ دوسرے کسی اجنبی کو نہیں- پوری دنیا میں انگریزی زبان آج Status Symbol بن گئی ہے، انگریزی کے حوالے سے آج یہ رجحان عام ہے کہ جو اس زبان سے واقف ہے وہی تعلیم یافتہ اور مہذب ہے- پھر بھی اگر دنیا کے لیے یہ کاغذی قانون کوئی انقلابی اور حیران کن قدم ہو تو ہو، اہل اسلام کے لیے نہیں- دنیا نے کاغذوں پر مساوات کو جتنی اہمیت دی ہے، پیغمبر اسلام نے اس سے زیادہ اہمیت نہ صرف زبان سے دی بلکہ مساوات کا عملی مظاہرہ کرکے بھی دکھا دیا، یہی وجہ ہے کہ وحدت انسانیت اور مساوات کا تصور اسلام کی اساسی تعلیمات میں شامل ہے اور جائے

تعجب تو یہ ہے کہ حقوق انسانی کا یہ اساسی تصور پیغمبر اسلام نے اس وقت دیا جب دنیا کو اس کی ہوا تک نہیں لگی تھی- حدیث پاک ہے:

یٰا یھا الناس الاان ربکم واحد و ان أباکم واحد الا لافضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لأ حمر علی أسود ولا لأسود علی احمر الا بالتقوی (مسند احمد، ۵/۴۱۱)

اے لوگو! سن لو بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے- سن لو کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سفید کو کسی سیاہ پر اور کسی سیاہ کو کسی سفید پر کوئی فضیلت نہیں ہے، فضیلت کی بنیاد صرف تقوی ہے-

اسلام نے تو نابالغ اور عورت کی حق ملکیت کو اس وقت تسلیم کیا تھا جب وہ خود ایک مال سمجھی جاتی تھی، اتنا ہی نہیں بلکہ غلاموں اور یتیموں کو بھی حق ملکیت دیا اور انہیں سوسائٹی کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا، سماج میں انہیں وقار اور عزت دی، جب کہ دنیا نے انہیں تمام انسانی حقوق ومراعات سے محروم کر رکھا تھا-

(۵) عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۱۸ میں ہے کہ ''ہر شخص کو کوئی بھی عقیدہ، فکر، رائے اور مذہب اختیار کرنے کا بنیادی حق ہے''- بدقسمتی سے یہ بنیادی حق بھی صرف کاغذی حصہ بن کر رہ گیا ہے- اس دستور کے مرتبین اور طاقتور ریاستیں اس بنیادی حق سے عام انسانوں کو محروم کررہی ہیں اور اسے دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کی اہانت اور اپنے ذاتی، ملکی اور سیاسی مفادات کے لیے استعمال کر رہی ہیں- آج دنیا کے بہت سے ممالک بشمول ہندوستان میں تبدیلی مذہب پر پابندی کی بات ہورہی ہے- پوری دنیا میں آج دنیا کے بہت سے ممالک بشمول ہندوستان کے ساتھ ظلم و جبر کیا جارہا ہے، آزادی اظہار رائے کے نام پر مغربی دنیا اسلامی نظریات کا مذاق اڑا رہی ہے لیکن اسی آزادی اظہار کے نام پر کوئی عیسائی مذہب، مغربی قوانین اور ان کی پالیسی کے خلاف کچھ نہیں بول سکتا-

رسول کریم نے صدیوں پہلے انسانوں کو عقیدے، فکر، رائے اور مذہب کی آزادی کا حق دے دیا تھا، اسلام کے نزدیک اگر کوئی شخص کوئی عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہے تو اس پر

کوئی پابندی اور جبر نہیں کہ اسے دوسرا دین اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے، ارشاد پاک ہے: لا اکراہ فی الدین ''دین میں کوئی جبر نہیں''-(سورہ بقرہ:۲۵۶)

ایک یہودی ہے تو یہودی رہے، ایک عیسائی ہے تو عیسائی رہے، ایک ہندو ہے تو ہندو رہے، اس کے مذہب وعقیدہ پر کوئی دباؤ نہیں، ہاں! لیکن انہیں اسلام کی دعوت ضرور دی جائے گی- اسے حقیقت سے آگاہ ضرور کیا جائے گا لیکن زبردستی اسلام میں داخل نہیں کیا جائے گا- پیغمبر اسلام نے اس حوالے سے اپنے رب کا فرمان دنیا کے سامنے پیش کیا: وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤ من و من شاء فلیکفر ''اور فرما دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے''-(کہف:۲۹) دنیا کا کوئی انصاف پسند مورخ یا محقق ایسی کوئی مثال نہیں پیش کر سکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ نے اسلام کی سر بلندی اور توسیع کے لیے اپنے اس تصور سے انحراف کیا اور اپنے اس اصول کو توڑا ہو-

(۶) عالمی منشور کے آرٹیکل نمبر ۲۶ میں ہے کہ ''ہر شخص کے لیے تعلیم کا حصول اس کا بنیادی حق ہے''-

اسلامی تاریخ کے واقف کار جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے تعلیم کی اہمیت، ضرورت اور اس کے حصول کے لیے اس وقت انسانوں کو کہا جب نہ تو علوم وفنون نے ترقی کے مدارج طے کیے تھے، نہ لوگ اس کی اہمیت وضرورت سے آشنا تھے اور نہ تعلیم کے بہترین نتائج اور مقصد سے واقف- اس تاریک ماحول میں پیغمبر اسلام نے جو تعلیم کا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا وہ آج کے ترقی یافتہ عالمی منشور کی دفعات سے کئی گنا زیادہ اہمیت کا حامل ہے، کیوں کہ عالمی منشور نے تعلیم کے حصول کو انسان کا بنیادی حق تسلیم کیا ہے جب کہ اسلام نے اس کے حصول کو فرض قرار دیا ہے- ظاہر ہے کہ کوئی کسی چیز کے حصول کو حق نہیں فرض قرار دے دے تو اس کے حصول کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے- میرا خیال ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ہر اس تعلیم کو فرض قرار دیا ہے جو مذہب وملت کی بھلائی اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے ہو- ارشاد نبی ہے:

''الحکمۃ ضالۃ المومن، حیث و جدھا فھو أحق بھا''-(حکمت مومن کی گم شدہ دولت ہے، وہ جہاں اسے پائے اس کا زیادہ حقدار ہے)

دو عالمی منشور کے درمیان بنیادی فرق:- مختلف طاقتور ریاستوں، سیکڑوں اعلیٰ دماغوں اور صدیوں کی ادھیڑ بن کے بعد حقوق انسانی کا جو خاکہ تیار کیا گیا ہے، وہ اہل اسلام کے لیے نہ تو نیا ہے اور نہ انقلاب آفریں، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے پیش کردہ عالمی منشور کا ہی چربہ ہے، جس میں کچھ لایعنی حذف واضافہ کے ساتھ اقوام متحدہ کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کر دیا گیا- اب یہاں بنیادی سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کا عالمی منشور اسلام کے منشور کا ہی چربہ ہے تو پھر اب تک عام انسان اپنے بنیادی حق سے کیوں محروم ہے؟ اور کیوں حکمراں اس منشور کی تشکیل کے ۶۰/برس سے زائد گزر جانے کے باوجود اب تک اپنی ریاستوں میں ان حقوق کو نافذ کر کے وہاں امن وامان، عدل و انصاف اور مساوات قائم نہیں کر سکے؟ میرا خیال ہے کہ اس کی چار بنیادی وجوہات ہیں، جن کی وجہ سے یہ منشور عالمی سطح پر ناکام ہو گیا، جب کہ نبی کریم ﷺ کا عالمی منشور اپنے نفاذ کی اہلیت کی وجہ سے عہد رسالت سے خلافت راشدہ تک صرف ۵۰/سالوں سے بھی کم مدت میں اسلام سمتوں میں پھیل گیا اور اسی منشور سے نبی کریم نے ایک آئیڈیل سوسائٹی کی تشکیل دی تھی جو اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہے-

اقوام متحدہ کے عالمی منشور کی ناکامی کی چار بنیادی وجوہات میں سے ایک ہے متفقہ اقتدار کا فقدان، دوسری قول وعمل میں تضاد، تیسری فطرت سے بغاوت اور چوتھی منشور کی تنفیذ کے نفسیاتی طریقے کا فقدان- جن کا ہم ترتیب وار مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں-

۱- اقوام متحدہ کے اس منشور کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہاں کوئی ایسا اقتدار اور قوت نافذہ نہیں جسے تمام ممالک تسلیم کریں، اس کی اطاعت میں سر جھکا دیں اور جو خود انسانیت کی شیرازہ بندی کر سکے، جس کی وجہ سے منشور کے انقلابی دفعات کاغذ کا ہی حصہ بنے ہوئے ہیں اور دنیا میں کشمکش اور تصادم کا طوفان برپا ہے- آج ہر ملک اپنے سیاسی، معاشی اور مذہبی مفادات کے لیے ایک دوسرے کو دبانے کے لیے کوشاں ہے،

نہ کوئی روکنے والا ہے اور نہ کوئی کسی کی سننے کو تیار ہے- لیکن نبی کریم ﷺ کے ذریعے جو منشور دیا گیا، وہاں اقتدار اعلیٰ اور قوت نافذہ پائی جاتی ہے- جو اللہ کریم کی ذات ہے، جس کی اطاعت سبھی پر واجب ہے اور جس کا حکم حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے-

۲- اقوام متحدہ کے عالمی منشور کی ناکامی کی دوسری بڑی وجہ قول و عمل کا تضاد ہے- جن لوگوں نے اس منشور کو مرتب کیا وہ خود منشور میں درج قوانین اور حقوق کی ادائیگی سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھنے لگے، جس کی وجہ سے دنیا سے عدل و انصاف اور امن و امان اٹھ گیا- جب کہ پیغمبر اسلام کی وہ واحد ذات ہے جس نے نہ صرف اپنے منشور کو پیش کیا بلکہ اس کو اپنی زندگی میں برت کر دکھایا- دنیا کا کوئی مورخ ایسی کوئی نظیر نہیں پیش کر سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق کی ادائیگی کے قوانین صرف دوسروں کے لیے بنائے جب کہ وہ خود ان کو ادا کرنے سے قاصر تھے-

۳- اقوام متحدہ کے اس منشور میں اپنے آپ کو ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ اور روشن خیال ثابت کرنے کے لیے عورت و مرد کے درمیان مساوات کی ہوڑ میں بعض ایسے قوانین بھی بنا دیے جو فطرت سے میل نہیں کھاتے، وہ حقوق صرف کاغذوں پر پڑھنے سے تو بھلے معلوم ہوتے ہیں عملی زندگی میں ان کا نفاذ ممکن نہیں- اگر ان حقوق کو طاقت کے زور پر نافذ کرنے کی کوشش کی جائے تو سوسائٹی میں اس کے نہایت خراب اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں-

۴- اقوام متحدہ کے منشور کے فلاپ ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس کے نفاذ کا کوئی نفسیاتی منصوبہ یا طریقہ ان کے پاس نہیں ہے- وہ ان حقوق کو طاقت کے بل پر قانون و عدالت اور سماجی، سیاسی اور معاشی قوت کے ذریعے نافذ کرنا چاہتے ہیں- انسان کی نفسیات ہے کہ جب کوئی چیز طاقت اور قانون کے زور پر نافذ کی جائے تو وہ قانون کو فریب دے کر اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب موقع ملے اس سے نظریں چرا لیتا ہے- نبی کریم کے منشور کی کامیابی کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اس کی تنفیذ کا ایک ایسا نفسیاتی طریقہ اختیار کیا کہ حقوق کی ادائیگی مسلمانوں کے لیے عبادت بن گئی-

اپنے اس منشور کو انہوں نے قانون کے ذریعے نافذ نہیں کیا بلکہ اسے اخلاقیات سے جوڑ دیا، حقوق ادا کرنے والوں کو اعلیٰ کردار کا حامل قرار دیا، ان کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں ثواب و جزا کی بشارت سنائی اور حق سلب کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے انہیں وعیدیں سنائیں- اخلاق و قانون کا رشتہ بڑا گہرا ہے، اگر کسی معاشرے میں اخلاقی حس بیدار ہو جائے تو وہ قانون سے زیادہ کارگر ہوتی ہے اور ہر شخص کسی دباؤ کے بغیر حقوق کی حفاظت کرنے کو تیار رہتا ہے- دو عالمی منشور کے اس اجمالی موازنے کے بعد اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ آج بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے ذریعے پیش کیا گیا اسلام کا عالمی منشور انسانیت کی درماندگی، پسماندگی اور خستہ حالی کا مداوا ہے، جسے دنیا کا کوئی دوسرا منشور نہیں پیش کر سکتا-



مشرقی اقدار اور مغربی اندازِ نظر

عیسائی مصنفہ کیرین آرمسٹرونگ (Karen Armstrong) کی عالمی شہرت یافتہ کتاب ''محمد-اے بائیوگرافی آف دی پرافٹ'' (Muhammad—A Biography of the Prophet) میں مصنفہ نے ضمنی طور پر ایک مشہور واقعہ نقل کیا ہے کہ چند جاپانیوں نے پہلی بار مغربی ممالک کا دورہ کیا، ان کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی کہ وہ جہاں جاتے وہاں کے مذہب کے بارے میں جاننے کی بھرپور کوشش کرتے، اس حیثیت سے انہوں نے عیسائی مذہب کو جاننے کے لیے بائبل کا مطالعہ کرنا شروع کیا، کافی مطالعہ کے بعد انہیں بڑی مایوسی ہوئی، جب وہ لوگ مطالعہ کے ساتھ دورہ کرتے ہوئے امریکہ پہنچے تو ان کی ملاقات ایک بہت بڑے عیسائی اسکالر سے ہوئی تو انہوں اس سے عیسائی مذہب کے تعلق سے اپنی مایوسی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہزار کوششوں کے باوجود وہ بائبل میں کسی مذہب کو نہ پاسکے- یہ سن کر وہ بڑا متعجب ہوا اور جو جواب دیا وہ وسیع تناظر میں غور و فکر کا متقاضی ہے:

Unless one approached these scriptures in a particular frame of mind, it was indeed difficult to find anything religious or transcendent in its account of the history of the ancient Jewish People (P:49)

''جب تک کوئی ان الہامی کتابوں کو ایک خاص زاویۂ نظر سے نہیں پڑھتا، اس کے لیے واقعتاً یہ ایک مشکل ترین مسئلہ ہے کہ وہ قدیم یہودیوں کی تاریخ کو سمجھنے میں کوئی مذہبی یا ماورائی چیز کو پاسکے-''

لیکن قرآن اپنی حقانیت کو منوانے کے لیے کسی خاص زاویۂ نظر (Frame of

Mind) کے ساتھ اپنے آپ کو مطالعہ کرنے کی بات نہیں کرتا بلکہ وہ نہایت اعتماد کے ساتھ کہتا ہے کہ: **سنریهم أیٰتنا فی الافاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق** عنقریب ہم کائنات اور خود ان کے اندر اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر واضح ہوجائے گا کہ حق وہی (قرآن) ہے-

دراصل یہ اعتمادِ حق کی بنیاد پر حاصل ہوتا ہے، خواہ انسان کسی بھی زاویۂ نظر سے پڑھے فطرت کے مظاہر خود اس کی اہمیت و معنویت کو تسلیم کروا لیتے ہیں- پچھلی ایک دہائی سے اسلام کے خلاف مشرق و مغرب میں جو فضا قائم ہوئی ہے وہ اسی ''ایک خاص زاویۂ نظر سے مطالعے'' کا نتیجہ ہے- اسی زاویۂ نظر نے اسلام کے بہت سے مسائل کے ساتھ خصوصاً مسلم خواتین کے مسائل کو بھی نشانہ بنایا ہے- کیونکہ جب یہ زاویۂ نظر مثبت ہوتا ہے تو بائبل میں محاسن و معارف کے جلوے دکھاتا ہے اور جب یہی منفی ہوتا ہے تو اسلامی اصول و ضوابط میں معائب تلاش کرتا ہے کہ ان میں شدت ہے، عورتوں کے حقوق کی پامالی ہے، تنگ نظری ہے اور استحصال ہے-

مغربی دنیا اور ساؤتھ ایسٹ ایشیا میں بالخصوص ہندوستان کا عجیب معاملہ ہے کہ یہاں ایک طرف مسلم خواتین کے پردے، تعدد ازدواج اور خواتین کی امامت کے مسئلے کو لے کر آئے دن آوازیں اٹھائی جاتی ہیں کہ اسلامی قوانین میں ترمیم و تنسیخ کی جائے، دوسری طرف یہی ممالک خواتین سے متعلق جرائم کے انسداد کے لیے آج تک کوئی جامع فارمولہ پیش نہیں کرسکے ہیں، عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کے واقعات میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے، خواتین کے ڈریس کوڈ کا معاملہ طول پکڑتا جارہا ہے، Female Foetus کو ضائع کرنے کا مسئلہ ہندو معاشرے میں ختم ہوتا نہیں دکھ رہا ہے، کارپوریٹ سیکٹر میں ملازمت کے عوض عورتوں کا جسمانی استحصال فیشن بن گیا ہے اور فلم انڈسٹری میں گلیمرس لائف کے بدلے نئی لڑکیوں کے ساتھ کاسٹنگ کاؤچ کے مسئلے نے ان کے تحفظ پر سوالیہ نشان کھڑا کردیا ہے- جبکہ مسلم خواتین کا ایک بڑا طبقہ ان مذکورہ جرائم سے اب بھی محفوظ ہے-

فکر و نظر میں بنیادی فرق:- دراصل مسلم خواتین کے تحفظ کی بنیادی وجہ وہ فکر ہے جو

مسلم اور غیر مسلم معاشرے کے درمیان خط فاصل کھینچتی ہے- اسلام کی فکر یہ ہے کہ اگر جرائم کا خاتمہ کرنا ہے تو ان اسباب کا خاتمہ کر دو جن کے ذریعے جرائم وجود پاتے ہیں- جبکہ میڈیا سے لے کر حکومت اور عام آدمی کی سوچ یہ ہے کہ مجرمین کی سزا اتنی سخت کر دو کہ وہ جرم کرنے سے قبل اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں- جرائم کے تعلق سے فکر و نظر کے اسی فرق نے مسلم معاشرے کو نسبتاً دوسرے معاشروں کے محفوظ کر رکھا ہے-

زنا بالجبر کے واقعات پر اگر غور کیا جائے تو اس کے چند بنیادی اسباب ہیں:

(۱) نیم عریاں لباس (۲) ذہنوں کو برانگیختہ کرنے والے لباس (۳) بے پردگی (۴) مخلوط طرز زندگی (۵) اور فحاشی- اسلام ان تمام اسباب پر پابندی عائد کرتا ہے تاکہ جرم کو سر ابھارنے کا موقع نہ مل سکے، اس کے بعد اگر کوئی زنا جیسے جرم عظیم کا ارتکاب کرتا ہے تو پھر اس کے لیے سزا کا اعلان کرتا ہے-

اس کے برخلاف آج میڈیا، حکومتیں اور آزاد قماش مفکرین ان اسباب پر پابندی کو حقوق نسواں کا استحصال قرار دیتے ہیں اور عورتوں کی عزت و ناموس کے ساتھ کھیلنے والوں کے لیے سخت تعزیر کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل واضح ہے کہ جس طرح غریبوں کو ختم کرنے سے غربت کا انسداد نہیں ہو جاتا، اسی طرح مجرمین کے خاتمے کے لیے صرف سزائیں مقرر کیے جانے سے جرائم کا خاتمہ ممکن نہیں، ان دونوں کے انسداد کے لیے پہلے ان کے اسباب و عوامل پر غور کرنا چاہیے اور پھر ان کے خاتمے کی کوشش کرنی چاہیے جن کے ذریعے معاشرے میں مجرمین کا وجود بڑھتا جا رہا ہے-

مڈل کلاس مسلم معاشرے نے اسلامی اصول و ضوابط کی روشنی میں جس قدر ان مذکورہ اسباب پر پابندی عائد کی انہیں اسی قدر تحفظ فراہم ہوتا گیا-

ایک مثال: - چند ماہ قبل ایک ٹیلی ویژن چینل نے بازار میں گھومنے والے مردوں کا خفیہ کیمرے کے ذریعے اسٹنگ آپریشن کیا، انہوں نے پہلے ایک خوبصورت لڑکی کو نیم عریاں اور برانگیختہ کرنے والا لباس پہنایا، اس کا زبردست میک آپ کیا اور اسے ممبئی کے ایک بارونق اور بھیڑ بھاڑ والے بازار میں کھڑا کر دیا، اب مردوں کی غلط نگاہ اس کی

طرف اٹھنا شروع ہو گئی، ہر شخص بری نظروں سے اسے گھور رہا تھا، گھورنے والوں میں جوان سے لے کر بوڑھے تک تھے، کتنے منچلوں نے تو اس پر گندے فقرے بھی کس دیے، یہ تمام مناظر چینل کا ایک خفیہ کیمرہ قید کر رہا تھا- اس کے تھوڑی دیر کے بعد ہی ان لوگوں نے اسی لڑکی کا گیٹ اپ بدل دیا اور اسے سلیقے سے شلوار اور قمیص پہنایا، میک اپ بھی قدرے ہٹا دیا گیا اور اسی جگہ اسے دوبارہ کھڑا کر دیا گیا، کافی دیر اسی جگہ کھڑے رہنے کے باوجود نہ تو اس پر کوئی غلط نگاہ ڈالنے والا تھا اور نہ اس پر جملے کسنے والا- ان مناظر کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن پر کمنٹری بھی کی جا رہی تھی کہ آج کل مردوں کی نظریں کتنی اوچھی اور غلط ہو گئی ہیں، عورتوں کا اب آزادانہ پہننا اوڑھنا مشکل ہو گیا ہے، معاشرہ کہاں جا رہا ہے، عورتیں اب محفوظ نہیں وغیرہ-

میری نظر میں یہاں ایک صحیح واقعے سے غلط نتیجہ اخذ کیا گیا، اس واقعے سے صحیح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسباب کی فراہمی ایسے واقعات کو جنم دیتی ہے جبکہ اسباب کے خاتمے سے جرائم کے امکانات ختم نہیں تو کم سے کم تر ضرور ہو جاتے ہیں- اسلام نے ایسے لباس، بے پردگی اور مخلوط طرز زندگی کی ممانعت اس لیے وارد کی تاکہ عورتوں کی پاک دامنی پر حرف نہ آ سکے، ان کی عصمت پر کوئی بری نگاہ نہ ڈال سکے اور سر عام انہیں کوئی رسوا نہ کر سکے، جبکہ موجودہ میڈیا اور فیشن ایبل معاشرہ ان اسباب کی حمایت کر کے نہ صرف عورتوں کی عصمت کو سر عام نیلام کر رہا ہے بلکہ جرائم کے اضافے کا باعث بھی بن رہا ہے-

ایسے میں یہاں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ پھر وہ ممالک جہاں ہندوستان سے زیادہ عریانیت عام ہے وہاں کثرت سے عورتوں کے ساتھ ایسے واقعات کیوں نہیں پیش آتے؟ اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ مشرقی تہذیب میں جسے عورت کی عفت و عصمت کہہ کر اس کی حفاظت کے سو جتن کیے جاتے ہیں، مغربی تہذیب کا مادر پدر آزاد معاشرہ اسے چائے کی ایک پیالی سے زیادہ نہیں سمجھتا، ظاہر ہے جہاں عورت سے اختلاط اس قدر آسان ہو وہاں زور زبردستی چہ معنی دارد؟ مسئلہ تو اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب گنگا کے ساتھ ٹیمس ندی کو بھی بہانے کی کوشش کی جائے-

ہندو معاشرہ ہو یا مسلم معاشرہ مشرقی تہذیب واقدار مرد وعورت کے آزادانہ اختلاط اورعریانیت کی نفی کرتے ہیں، اب اگر ایسی صورت میں جہاں مشرقی تہذیب کے پاس و لحاظ کا خیال بھی ہو اور مغربی تہذیب کی چکا چوند میں گرفتار ہو کر عریانیت، بے پردگی اور مخلوط طرز زندگی کی حمایت بھی تو پھر ایسے تضاد ونفاق پر مشتمل معاشرے سے عورتوں کا جسمانی اور ذہنی استحصال تصور سے بعید نہیں ہونا چاہیے-

معاشرتی زوال کے باوجود آج بھی مسلم ممالک میں عورتیں صرف اس لیے محفوظ ہیں کہ وہاں عریانیت اور فحاشی نے ظاہری طور پر ابھی اپنے پاؤں پوری طرح نہیں پسارے ہیں، زندگی کے بہت سے شعبوں میں مغربی تہذیب سے وابستگی کے باوجود وہ ابھی اتنی ہمت نہیں کر پائے ہیں کہ اپنے قومی اور مذہبی شعار ولباس کو اپنے بدن سے نوچ کر پھینک سکیں- مگر پچھلی دو دہائیوں سے ہندوستانی معاشرہ اپنے ناعاقبت اندیش سیاسی و مذہبی لیڈروں کی رہنمائی میں اسلامائزیشن کے خوف سے اپنا مشرقی اقدار بھول رہا ہے، اس لیے آج ہر روز ہماری نظروں کے سامنے ایسی خبریں ہوتی ہیں جہاں ۳ رسال کی بچی سے لے کر ۵۰ سال کی خاتون تک کی عصمتیں تار تار ہو رہی ہیں-

عورت کا تحفظ یا استحصال؟:- یکم مئی ۲۰۰۸ء کو ٹائمس آف انڈیا میں ایک خبر آئی کہ ''سلمان رشدی شادی کو ضروری نہیں سمجھتے'' "Rushdie no longer finds marriage necessary"(P:21) رشدی نے چار شادیاں کی ہیں، رشدی کی پہلی شادی 1976ء سے 1987ء تک رہی، دوسری 1983ء سے 1993ء تک، تیسری 1997ء سے 2004ء تک جبکہ چوتھی 2004ء سے جولائی 2007ء تک، چار چار شادیاں رچانے کے بعد بھی اس کے نزدیک عورتوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے شادی غیر ضروری عمل ہے، پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟ رشدی کا بیان ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں شادی کا جوڑا پہننا چاہتی ہیں- Girls just wants to wear a wedding dress.

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ رشدی کے نزدیک عورت کی حیثیت "Use & Throw" سے زیادہ نہیں- فکر ونظر کا یہ بھی عجیب دھوکہ ہے کہ عورت کی اس حیثیت کی

طرفداری ملکی وبین الاقوامی میڈیا بھی کرتا ہے، حکومتیں بھی اور غیر مسلم معاشرہ بھی اور حیرت تو یہ ہے کہ اس حیثیت کو وہ عورت کی آزادی سے تعبیر کرتے ہیں اور تعدد ازدواج کا مذاق اڑاتے ہیں- اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت اسی لیے دی تاکہ معاشرے سے فحاشی، عریانیت اور بدکرداری کا خاتمہ کیا جائے، اگر کسی شخص کی جنسی ضرورتیں ایک سے پوری نہیں ہوتیں تو اس کے ساتھ دو، تین یا چار شادیاں کر سکتا ہے، مگر اس لازمی شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی تمام بیویوں کے ساتھ عدل وانصاف کر سکے، انہیں یکساں پیار ومحبت دے سکے، ان کی زندگی کی ضرورتیں پوری کر سکے، اگر کوئی ان شرطوں کو پوری کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو پھر اسے اجازت نہیں- تعدد ازدواج میں سراسر عورتوں کا ہی فائدہ ہے کہ اس کا شوہر قانونی، مذہبی اور سماجی طور پر پابند ہو جاتا کہ وہ اس کی عزت وکفالت کرے، اسے محبت ووقار دے، برخلاف وہ طریقہ جس کی ترغیب رشدی جیسے لوگ دیتے ہیں اور میڈیا ومعاشرہ جن کی حمایت کرتا ہے، وہ عورتوں کے ساتھ صرف جنسی استحصال ہے نہ کہ ان کے حقوق کی پاسداری اور آزادی- میرے نزدیک ایک عورت کی ایسی زندگی اس طوائف کی زندگی سے مختلف نہیں جو بازار میں اپنا جسم بیچتی ہے، اس طرز زندگی کو عزت ووقار میں اگر کوئی رشتہ تبدیل کرتا ہے تو وہ ہے شادی کا-

اسلام نے عورتوں کے ساتھ تعدد ازدواج کی اجازت دے کر یہاں بھی ان اسباب کا انسداد کر دیا جن سے زنا، فحاشی، عریانیت اور بدکرداری کو معاشرے میں فروغ ملتا تھا اور ساتھ ہی عورتوں کی عصمت وعزت کے تحفظ کا سامان بھی کر دیا کہ انہیں کوئی بازار میں بکنے والی شئی نہ سمجھے- حیرت ہے کہ حکومتیں عورتوں کو اپنا جسم بیچنے کے لیے انہیں لائسنس دینے کو تیار ہیں، میڈیا اور غیر مسلم معاشرہ عورت کی اس طرز زندگی پر راضی ہے مگر عزت کے ساتھ عورت کو نکاح کر کے اپنے حرم سرا میں داخل کرنے کو تیار نہیں، میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ ان کا تحفظ ہے یا استحصال؟

اعتراف حقیقت:- اسلام نے واضح طور پر کہا ہے کہ کائنات میں اور خود ان کے اندر ہم اپنی نشانیاں دکھائیں گے اور انہیں اعتراف کرنا ہوگا کہ حق وہی ہے- یہاں نشانیوں سے

قرآن کا مطلوب صرف مادی اشیاء کا ظہور نہیں ہے بلکہ ہر اس شئی کا ظہور ہے جس سے حق کی طرف رہنمائی ہو- اس حیثیت سے دیکھیں تو آج پوری دنیا میں اسلامی نظریات اور اسلامائزیشن کے خلاف تحریکیں چل رہی ہیں مگر اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ قدم قدم پر انہیں سیاسی، فکری، سائنسی اور معاشرتی بحران کو دور کرنے کے لیے اسلامی نظریات کی طرف مجبوراً لوٹنا پڑ رہا ہے، وہ یہ اعتراف اگر چہ نہ کریں کہ حق وہی ہے جس کی طرف اسلام نے رہنمائی کی ہے مگر وہ اسی نظریے اور تھیوری کو اپنانے پر مجبور ہیں جسے صدیوں پہلے اسلام نے پیش کیا تھا-

اس کی تازہ مثال ہندوستانی یونیورسٹیز میں اٹھنے والا ڈریس کوڈ کا مسئلہ ہے- ہندوستانی یونیورسٹیز میں پچھلے چند سالوں سے لڑکیوں کے ساتھ زنا، چھیڑ چھاڑ اور زور زبردستی کے واقعات میں کافی اضافہ ہوا ہے، پہلے پہل تو ان اداروں کے ذمہ داران نے ان واقعات کی روک تھام کے لیے بہت سے قوانین بنائے اور انہیں نافذ کرنے کی کوشش کی، مگر سارے قوانین فلاپ ہو گئے اور پھر آخر میں ہندوستان کی تین یونیورسٹیز نے طالبات پر ڈریس کوڈ نافذ کرنے کا فیصلہ کیا اور اسلامی تھیوری کا اعتراف اس طرح کیا گیا:

The dress code will protect women from violent crime. Bomboy Univeristy plans to ban women from wearing mini skirts, tight tops and shorts, saying this will help prevent rape. Officials at the university say they would prefer to see women students in a traditional Salwar-Kameez with no deep neck line.

''ڈریس کوڈ عورتوں کو جرائم سے محفوظ رکھیں گے- ممبئی یونیورسٹی لڑکیوں کو منی اسکرٹ، چست اور مختصر لباس پر پابندی عائد کرنے کا ارادہ کر رہا ہے کہ یہ پابندی انہیں زنا سے محفوظ رکھے گی- یونیورسٹی کے ذمہ داران کہتے ہیں کہ وہ لڑکیوں کو ایسے روایتی شلوار اور قمیص میں دیکھنا چاہتے ہیں جس کا گلا بھی بہت بڑا نہ ہو''-

حالانکہ اس ڈریس کوڈ کی چند لوگوں نے مخالفت بھی کی، ان مخالفین میں زیادہ تعداد

انہی لوگوں کی تھی جنہیں ہندوستان میں غیر شعوری طور پر اسلامائزیشن کے نفاذ کا خطرہ تھا-

اسلامائزیشن کی بنیاد پر حقائق کا اعتراف نہ ہو، اسلام کا مطالعہ کسی بھی زاویے نظر سے کیا جائے مگر آفاق و انفس میں قدم قدم پر حق کی علامتیں ظاہر ہو رہی ہیں، جہاں انسانیت کو اسلامی تھیوری کی طرف پلٹنے کے سوا اور کوئی صورت نہیں دکھتی- عورتوں کے مسائل نہایت حساس اور نازک ہیں، ان میں مسلم اور غیر مسلم معاشرے کی تخصیص نہیں، اگر مسلم معاشرہ بھی اپنے مذہبی اقدار کی پاسداری میں تامل کرتا ہے تو وہ بھی ان جرائم سے محفوظ نہیں رہ سکتا- آج مغربی معاشرہ خواہ ظاہری طور پر کتنا بھی آزادی نسواں کا علمبردار بنا رہے مگر اندورنی سطح پر آزادی کے بھیانک نتائج اسے بھگتنے پڑ رہے ہیں اور اچھی اور پر سکون معاشرتی زندگی کے لیے وہ ہر پل تڑپ رہا ہے-



انقلاب ۱۸۵۷ء کے حقیقی داعی

ایک انگریزی مؤرخ نے کبھی کہا تھا کہ ''کسی واقعہ کو زیادہ عرصے تک حافظہ میں محفوظ رکھنے کی صلاحیت مشرقی دماغ کو فطرۃً کسی قدر زیادہ نصیب ہوئی ہے''۔لیکن ۱۸۵۷ء جیسے اہم اور عظیم انقلاب کے حوالے سے ہندوستانیوں کی یادداشت کو دیکھ کر مذکورہ قول کی صداقت کا یقین نہیں آتا۔ ۲۰۰۷ء میں انقلاب ۱۸۵۷ء کو برپا ہوئے ڈیڑھ سو سال پورے ہو گئے ،اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج تک انقلاب کے تمام پہلوؤں پر مشتمل ہندوستان میں اس کی مستند، مربوط اور مکمل تاریخ نہیں لکھی جا سکی ہے، جبکہ دنیا کی معلوم تاریخ میں صرف آزادی کی جدوجہد کی پاداش میں انسانی لاشوں سے کنویں بھرنے ،توپوں سے اڑانے اور زندہ جلانے کی مثال اگر کہیں ملے گی تو اسی ۱۸۵۷ء کی معرکہ آرائی میں، لیکن ہندوستانیوں کے ذہن سے شاید برطانوی حیوانیت اور درندگی کے وہ ماہ و سال مٹ گئے جو ان کی سرد نبضوں کو حرارت پہنچاتی رہتی، غالباً اسی لیے نہ تو وہ اس المناک حادثے کی مربوط تاریخ لکھ کر نئی نسلوں کو روشناس کرا سکے اور نہ ہی ان حقیقی جانباز مجاہدین کو یاد رکھ سکے، جن کے جرأت مندانہ اقدام ہی ہماری آزادی کے باعث بنے۔اس کے برعکس مغربی مؤرخین نے اس حادثے کے تعلق سے جو واقعات اپنی کتابوں میں لکھے ہیں وہ بالکل افسانوی اور فرضی نوعیت کے تھے، جن میں انہوں نے اپنی مظلومیت اور ہندوستانیوں کے ظلم و جبر کو دنیا کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں اس حوالے سے جو تاریخیں لکھی بھی گئیں تو ان میں سیاسی اور قومی رنگ غالب رہا، چنانچہ ہندوستانی مؤرخین جو اکثریتی فرقے سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے مسلمانوں کو بالعموم اور علما کو بالخصوص آزادی

کی اس پہلی انقلابی جنگ سے غائب کر دیا یا ان کے کارناموں اور قربانیوں کو نہایت کم کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا، حالانکہ انگریزی حکومت اور مغربی مؤرخین کا اعتراف اور لائبریریوں میں محفوظ وہ سینکڑوں سرکاری و غیر سرکاری دستاویزات ہمیں بتاتے ہیں کہ اس انقلاب کے سب سے بڑے داعی اور محرک اگر کوئی ہے تو وہ مسلمان خصوصاً علما ہیں۔ اس جرم کے عوض انگریزی حکومت نے اس طرح انہیں سیاسی، سماجی، تعلیمی اور معاشی جہتوں سے مفلوج کیا ہے کہ وہ آج تک ہندوستان میں اکثریتی طبقے کے بالمقابل کھڑے نہیں ہو سکے ہیں، انگریزی حکومت کی ہندوؤں کے ساتھ مراعات اور مسلمانوں کے ساتھ یہی معاندانہ رویہ ہی آگے چل کر بالواسطہ تقسیم ہند کی بنیاد بن گیا۔

۱۰/مئی ۲۰۰۷ء کے ایڈیشن میں ٹائمز آف انڈیا (دہلی) نے ۱۸۵۷ء کے تعلق سے پہلے صفحے پر اس بات کا کھل کر اعتراف کیا ہے کہ:

The main targets of the suppression were the muslim ulema, weavers and peasants, since the British blamed them for being the masterminds behind the revolt

(ظلم و بربریت کا جنہیں نشانہ بنایا گیا ان میں مسلم علماء، بُنکر اور کسان سر فہرست تھے، کیونکہ برطانوی حکومت نے بغاوت کے پیچھے ان ہی لوگوں کے بنیادی کردار ہونے کا الزام عائد کیا تھا) انگریزی سرکار کا یہ الزام غلط بھی نہیں تھا۔

انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل مسلمانوں کی حالت: ۔۷۱۲ء میں سندھ میں محمد بن قاسم کے حملے سے ۹۰/سال قبل ہی ہندوستان میں اسلام پھیل چکا تھا، محمد بن قاسم کے حملے کے بعد مسلمانوں نے رفتہ رفتہ ہندوستان میں کافی قوت حاصل کر لی، مسلمانوں کی یکے بعد دیگرے فتوحات نے ہندوستانی تاریخ کو کافی متاثر کیا، اسی طرح ان کی تہذیب و ثقافت نے ایک نئے سماج کی تشکیل دی۔ مسلمانوں نے اپنی تعلیم اور فکر و فن سے اس کی رگوں میں برقی لہر دوڑا دی۔ عہد سلطنت ۱۲۰۶ء سے لے کر مغلیہ سلطنت کے زوال کی شروعات جنگ پلاسی کے اختتام کے بعد ۱۲/اگست ۱۷۶۵ء تک مسلمانوں کے عروج کا دور رہا ہے، مسلم سلطنت کے اس تقریباً سات سو سالہ دور میں مسلمانوں کے پاس اعلی سرکاری مناصب تھے،

بڑی بڑی ریاستیں ان کے زیرنگیں تھیں، عدلیہ اور انتظامیہ کے بڑے عہدے ان ہی کے پاس تھے، علما، فضلا، ادبا اور شعرا کا خاص مقام تھا، جنہیں ان کی اہلیت اور مناسبت سے اعزازات دیے جاتے تھے، اسی طرح تعلیمی امور بھی مسلمانوں کے ہی ہاتھوں میں تھا-

مغلیہ سلطنت کے زوال سے قبل مسلمان اپنے دینی امور اور مذہبی معاملات میں بڑے ہی متصلب تھے اور مسلم معاشرے پر علماء کی مضبوط گرفت تھی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی حکومت میں ہندو رعایا کے ساتھ کوئی قابل ذکر ظلم نہیں کیا، نہ ان کے مذہب کو تبدیل کرنے کی تحریک چلائی اور نہ اسلامی روایات ان پر مسلط کیں، حالانکہ مسلمان اس پوزیشن میں تھے کہ اپنی سات سو سالہ زریں تاریخ میں اپنی بے پناہ عسکری قوت سے اپنی عددی قوت کو اکثریت میں تبدیل کر سکتے تھے، لیکن مسلمان اس وقت بھی اقلیت میں ہی تھے-اس سلسلے میں پروفیسر مسعود احمد (کراچی) نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ:

''پاک و ہند کے مسلمان طبعاً روادار ہیں، روادار نہ ہوتے تو ایک ہزار برس کے طویل دور حکومت میں ہندو الگ حکومت قائم کرنے کی کوشش کرتے، کیونکہ وہ اکثریت میں تھے، مگر اکثریت کے باوجود ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی، جس سے مسلمانوں کی بے مثال رواداری کی تصدیق ہوتی ہے اور تاریخ کے اوراق اس حقیقت کی توثیق کرتے ہیں''-(دو قومی نظریہ اور پاکستان، ص:۵، مطبوعہ ادارہ مظہر اسلام لاہور، پاکستان)

اس کے برخلاف برطانوی حکومت کے سو برس کے اندر ہی ۱۸۵۷ء میں ان کے خلاف ہندوستانیوں نے جنگ کا اعلان کر دیا اور دو سو برس کے اندر انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا، کیونکہ ہندوستانیوں کے ساتھ جس طرح حیوانیت کا انہوں نے مظاہرہ کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا-

انگریزی تسلط کے بعد مسلمانوں کی حالت: -ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۰ء میں ہندوستان تجارت کی غرض سے آئی اور پھر رفتہ رفتہ اپنی عیاری سے مختلف ریاستوں پر قابض ہو گئی- جنگ پلاسی کے اختتام کے بعد مغل شہنشاہ شاہ عالم نے ۱۲/اگست ۱۷۶۵ء کو باضابطہ طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی کے تمام حقوق عطا کر دیے، جس کی وجہ سے کمپنی کو یہ اختیار حاصل

ہو گیا کہ وہ سرکاری محاصل وصول کر سکے-اور پھر کمپنی کی طاقت مستحکم ہوتی چلی گئی-اس کے بعد بھی مسلمان اعلیٰ عہدوں پر تھے، سرکاری زبان فارسی ہی تھی، فوجداری مقدمات کے فیصلے بھی وہی کیا کرتے تھے اور بنگال کے عدلیے اور مالیے کا انتظام و انصرام بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا- لیکن ۱۷۸۳ء میں لارڈ کارنوالس نے عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کر کے دونوں کے علیحدہ عہدے دار متعین کیے اور ان دونوں شعبوں میں اعلیٰ مناصب انگریزوں کے لیے مختص کر دیے، ان تبدیلیوں کی وجہ سے مسلمانوں پر نہایت مضر اثرات مرتب ہوئے، کیوں کہ اس طرح بہت سے مسلم امراء کو بڑے عہدوں سے ہاتھ دھونا پڑا- مسلم جاگیر داروں سے سرکاری محصول کی وصولیابی کا حق چھین لیا گیا اور مسلم عمائدین کی جگہ انگریز تعلقہ داروں (کلکٹروں) نے لے لی، پھر بندوبست PermanentSettlement کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے مسلمان اپنی زمینوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جنہیں ہندوؤں نے خریدنا شروع کر دیا، اس طرح بنگال میں ہندوؤں کی خوشحالی اور مسلمانوں کی زبوں حالی کا آغاز ہو گیا- بنگال کے علاوہ ہندوستان کی دیگر ریاستوں پر بھی سیاسی وسماجی تبدیلیوں نے مسلمانوں کو ہر میدان میں کافی متاثر کیا- انہی دنوں ایک اور قیامت مسلمانوں پر گزری، لارڈ ولیم بینٹنگ نے گورنر کے عہدے پر فائز ہوتے ہی زمین داروں کی ملکیت کے دستاویزات کی جانچ کا حکم دے دیا، اس کے لیے خصوصی عدالتیں بھی قائم کی گئیں، جو مسلمان بھی مغل عطیات کے تعلق سے اپنی ملکیت ثابت نہ کر سکا اسے اپنی زمین و جائیداد سے دست بردار ہونا پڑا، اس طرح ہزاروں لاکھوں مسلمان قلاش ہو گئے- ۱۸۳۷ء میں مسلمانوں پر ایک اور افتاد آ پڑی جب انگریزی حکومت نے فارسی زبان کو سرکاری زبان کے طور پر ترک کر کے اس کی جگہ انگریزی و دیگر صوبائی زبانوں میں سرکاری کام کاج شروع کر دیا، جس کی وجہ سے ہزاروں مسلمانوں کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ گیا، کیونکہ مسلمان نہ تو انگریزی سے واقف تھے اور نہ تیلگو، بنگالی، اڑیہ اور مراٹھی زبانوں سے، جب کہ ان زبانوں کا اچھا خاصا ارتقاء انگریزی حکومت کے زیر سایہ ہو رہا تھا- پھر اسلامی ضابطۂ فوجداری کی جگہ تعزیرات ہند کے نفاذ نے تو رہی سہی مسلمانوں کی حالت کو بھی ختم کر ڈالا-

مسلمانوں کی اس ابتر صورت حال کا ذکر پی-سی جوشی کی مرتب کردہ کتاب ''انقلاب اٹھارہ سوستاون'' میں بھی ہے-معروف محقق تلمیذ خلدون قدیم دستاویزات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''ادھر مذہبی اوقاف کی ضبطی نے قدیم مسلمان خاندانوں پر ناگوار اثر ڈالا اور انہیں مشتعل کر کے بغاوت پر آمادہ کیا، اُدھر جدید طریقہ تعلیم سے جس میں انگریزی زبان، مغربی ادب اور سائنس کو فوقیت حاصل تھی، روشن خیال مسلم طبقہ کی وقعت خاک میں مل گئی- کے (Keye) اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ'' ہمارے تعلیمی اقدامات اور ہمہ گیر انگریزیت جس سے ملک کو خطرہ درپیش تھا، شان مسلمانی کو گھٹانے اور اس متعصب دین کے بہت سے بارسوخ لوگوں کو ان کی آمدنی سے محروم کرنے کا موجب ہوئے''- عدالتوں میں فارسی زبان کے ترک سے اور سرکاری ملازمت میں امتحان کی بنا پر بھرتی سے مسلمانوں کے لیے سرکاری نوکری کے مواقع اگر یکسر مٹے نہیں تو کمتر ضرور ہو گئے-''

(ص:۲۹،مطبوعہ قومی کونسل دہلی)

ان حالات میں مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی چنگاری کا اندر ہی اندر سلگنا فطری تھا- انگریزی حکومت کا مسلمانوں کے ساتھ سوتیلا رویہ صرف اس لیے تھا کہ وہ اپنے مذہبی اور شرعی امور میں کوئی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رویہ محکومانہ نہیں تھا، جس کی وجہ سے انگریزی حکومت کے اعلیٰ عہدیداران محسوس کرتے تھے کہ مسلمان ان کی حکومت اور مذہب کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں، پھر یہ کہ انگریزوں کے خلاف ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۷۹۷ء کی جنگ میسور کی قیادت بھی مسلمانوں نے ہی کی تھی-

اس کے برعکس ہندوؤں کے ساتھ حکومت کا رویہ رحم دلانہ تھا، کیونکہ وہ حکومت کے ہر جائز و ناجائز حکم پر سر جھکا دیتے تھے خواہ وہ مذہبی معاملات میں سمجھوتے کی بات ہو، انگریزی زبان کو قبول کرنے کا مسئلہ ہو یا پھر ان کی ناجائز محکومی کی بات- انگریزی حکومت جانتی تھی

کہ مذہبی بنیادوں پر عوام سے حکمرانوں کا اختلاف حکومتی امور کی انجام دہی میں کافی مشکل ہوگا، اس لیے انہوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے اپنے ادارے کھولنے شروع کیے تاکہ لوگ عیسائیت قبول کریں اور بڑے پیمانہ پر انگریزی تعلیم کے لیے گاؤں گاؤں میں اسکول کھولنے شروع کیے، ہندؤں نے تو اسے آسانی سے اپنا لیا اور ترقی کرتے رہے مگر مسلمانوں نے ایسی کسی بھی تعلیم کو حاصل کرنے سے انکار کر دیا جس کی بنیاد مغربیت پر ہو، کیونکہ وہ حکومت کا منشا خوب اچھی طرح محسوس کر رہے تھے-اس صورت حال کا نقشہ علامہ فضل حق خیرآبادی (وفات:۱۸۶۱ء) نے یوں کھینچا ہے:

''انہوں (انگریزی حکومت) نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہو گا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا، اس لیے پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب و ملت کو مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا، انہوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے، پچھلے زمانے کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی''-

(باغی ہندوستان:ص:۳۱:مطبوعہ المجمع الاسلامی، مبارک پور)

آگے فرماتے ہیں کہ'' ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے، مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف و پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکام دین مبین کو مٹانا غیر ذالک''-(ایضاً)

مسلمانوں کے تعلق سے انتہا پسندانہ نظریات:-سلطنت مغلیہ کے عملی زوال کے بعد مسلمان جس طرح انگریزی حکومت کی سازش کا شکار ہوئے اس نے ان کے اندر انگریزوں کے خلاف نفرت و کراہیت کے جذبے کو تیز تر کر دیا، اسی جذبے کے تحت مسلم علما، قائدین اور عمائدین نے انگریزی سرکار کے خلاف منصوبے تیار کرنے شروع کر دیے تاکہ انہیں ملک سے باہر نکال کر آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں-مسلم علماء اور قائدین کے اس خفیے

منصوبے کی اطلاع انہیں ملتی رہتی تھیں اور وہ مسلمانوں کو ہی اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے، اس لیے مسلمانوں کو ملک میں بے دست و پا کرنے کے لیے انہوں نے مختلف اسکیموں اور منصوبوں پر عمل کرنا شروع کر دیا، ان کا ہر منصوبہ مسلمانوں کی بربادی کو لے کر سامنے آتا- تاریخ میں مسلمانوں کے تعلق سے ان کے انتہا پسندانہ نظریات کا اظہار ان کے خطوط، مضامین اور احکام سے ہوتا ہے- مسلمانوں کے تعلق سے انگریزی سرکار کی بیزاری کا رجحان ۱۸۴۲ء میں اس وقت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا جب لارڈ ایلن برو Lord Ellen Borough نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا- موصوف گورنر ہندوؤں کے لیے اپنے دل میں خاص گوشہ رکھتے تھے جب کہ مسلمانوں سے انہیں نفرت کی حد تک دشمنی تھی، جس کا اظہار انہوں نے کئی موقعوں پر کیا- ایک مرتبہ ہندو دوستی میں انہوں نے محمود غزنوی کے ہاتھوں تاراج کیے ہوئے سومنات مندر کے دروازوں کی تجدید کے موقع پر ہندو راجاؤں اور رہنماؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

''آج بالآخر آٹھ سو سالہ پرانی بے عزتی کا بدلہ لے لیا گیا'' موصوف کی یہ دیرینہ خواہش بھی تھی کہ مغل شہنشاہ اور ان کا خاندان شاہی محل کو خالی کر دیں اور ان کے تمام القاب و خطابات اور مراعات واپس لے لیے جائیں تاکہ یہ ساری چیزیں ملکۂ برطانیہ کے نام سے منسوب ہو سکیں، اس نے ہندو مسلم کے مابین توازن رکھنے کے لیے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ ''مسلمانوں کا دماغ درست کیا جائے''- (پس منظر: ۱۸۵۷ء ص:۲۱)

گورنر جنرل کی حیثیت سے اس کے لیے اپنے تمام تر انتہا پسندانہ نظریات کو عملی جامہ پہنانا آسان بھی تھا، اس لیے اس نے اپنے عہد گورنری میں مسلمانوں پر کافی ظلم ڈھائے- اسی طرح لارڈ ڈلہوزی کا سلوک بھی مسلمانوں کے ساتھ کافی معاندانہ رہا، جب کہ برطانوی حکومت کے نظم و نسق کے سلسلے میں اسی کا اہم اور فیصلہ کن کردار رہا ہے- ۱۸/ اگست ۱۸۵۳ء کو اس نے اپنے ایک دوست کو ذاتی نوعیت کا خط لکھا جس کے ذیل کے اقتباس سے مسلمانوں کے تعلق سے اس کی مخصوص ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

''اودھ کا بادشاہ خرد ماغی کی جانب مائل نظر آتا ہے، میں چاہتا بھی یہی ہوں کہ ایسا ہی ہو، اپنی روانگی سے پہلے اسے ہضم کر پانا میرے لیے بڑی طمانیت کا باعث ہوگا- دلی کا بوڑھا بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) اپنی موت آپ مر رہا ہے، اگر کورٹ آف ڈائرکٹرس کی فرسودہ حماقت آڑے نہ آتی تو میں کبھی کا اس کھوسٹ کے ساتھ ہی خاندان تیمور کا خاتمہ کر چکا ہوتا''-

(ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج: ص:۲۱)

انقلاب ۱۸۵۷ء کے فوری بعد جنرل رسل نے بھی لندن کے اخبار ''دی ٹائمز'' کو جو خط لکھا ہے، اس میں مسلمانوں کے تعلق سے اس نے جس گندی ذہنیت کا ثبوت دیا ہے وہ تمام ہندوستانیوں کے لیے دیدۂ عبرت نگاہ ہے- وہ لکھتا ہے کہ ''ہمیں شمع محمدی کے پروانوں کے ساتھ جو معاندت ہے وہ اس مخاصمت کے مقابلے میں زیادہ شدید ہے جو ہم شیو Shiva اور وشنو کے پرستاروں کے ساتھ رکھتے ہیں، مسلمان ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں، اگر ہم بیک جنبش محمد کی حدیثوں اور معبدوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ بات عیسائی مذہب اور برطانوی حکومت دونوں کے لیے فال نیک ثابت ہوگی''- (ایضاً: ص:۲۳)

انگریزی حکومت کے یہ تین مخصوص اور اعلیٰ عہدے داروں کی ذہنیت سے حکومت کا مسلمانوں کے تعلق سے نفرت آمیز نظریہ واضح ہو جاتا ہے، انقلاب ۱۸۵۷ء کے تعلق سے اگر کتابیں کھنگالی جائیں تو مسلمانوں کے حوالے سے نفرت و تعصب پر مبنی بے شمار واقعات اور اقوال سامنے آتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان نفرتوں کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مسلمان انگریزی حکومت سے کسی قیمت پر بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے-

انقلاب ۱۸۵۷ء کے حقیقی داعی اور محرک: -انگریزی حکومت کے ہندوستان میں تسلط کے بعد سے ہی مسلمان ان کے خلاف برسرپیکار تھے اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے سو برس بعد بھی ان کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں بغاوت کی چنگاری سرد نہیں پڑی تھی، گو کہ جنگ پلاسی اور جنگ میسور میں جن کی قیادت دو غیور مسلمان کر رہے تھے،

ہندوستانیوں کو شکست ہوئی، لیکن مسلمانوں نے ہمت نہیں ہاری تھی- وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ان کی عظمت رفتہ کی بحالی کی آخری کوشش ہے، اس لیے انہوں نے اس جنگ میں پورے جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا اور اس کی کامیابی کے لیے اپنے لاکھوں افراد جن میں بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھیں بے دریغ جانوں کا نذرانہ پیش کیا- مشہور مغربی مصنف رسلمین نے اس وقت جب ہندوستان کا دورہ کیا تو وہ جہاں کہیں بھی گیا مسلمانوں میں احساس آزادی کی شدت کو اچھی طرح محسوس کیا، انقلاب کے بعد جب اس نے اپنے مشاہدات کو قلم بند کیا تو یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ:

''۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں نے اپنے کھوئے ہوئے وقار کی باز یافت کی بھر پور کوشش کی لیکن اس بار انہوں نے بالکل ہی مختلف قسم کے حالات میں ایک انوکھا کردار نبھانے کی کوشش کی''(ایضاً ص:۱۹)

۱۸۵۷ء میں انگریزی سرکار کے خلاف مسلمانوں کی صرف بغاوت نہیں تھی بلکہ ملک کو آزاد کرا کر اپنے کھوئے ہوئے وقار کی باز یافت کی آخری جان توڑ کوشش تھی، اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ تھی، لیکن ان میں قیادت اور تنظیم وتربیت کا فقدان تھا، بیشتر مسلمان قلاش ہو چکے تھے اور مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز ان کا شہنشاہ ضعیفی اور بے بسی کی زندگی گزار رہا تھا، اس کے باوجود ان کی طاقتیں کمزور نہیں پڑی تھیں اور وہ اس جنگ کی قیادت کر رہے تھے، سر جارج کیمبل نے اس انقلاب کے بعد لندن کے اخبار ''دی ٹائمز'' کو ایک خط لکھا اور اس بات کا اظہار کیا کہ: ''سب سے واضح، مقبول اور شدید نظریہ یہ ہے کہ بغاوت مسلمانوں نے کی تھی''(ایضاً ص:۲۳)

۱۰ر مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں بغاوت سے عین قبل چپاتیوں کی تقسیم کی گئی جو انقلاب کے لیے تیار ہونے کا اشارہ تھا، اس چپاتی مہم کا آغاز بھی مسلمانوں نے کیا، کیونکہ چپاتی کے ساتھ گوشت کا ٹکڑا بھی تھا، ظاہر ہے کہ یہ کام مسلمانوں کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا، اس سلسلے میں کرنل جی بی مالیسن نے کہا کہ: ''فیض آباد کا مولوی احمد اللہ شاہ یقیناً سازش کا ایک لیڈر تھا''

کیو براؤن کا بیان ہے کہ: ''پنجاب سرکار نے شروع ہی سے یہ اعلان کر دیا تھا کہ بغاوت کا آغاز دراصل ہندوستانیوں اور مسلمانوں کی طرف سے ہوا''-

گبنس، براؤن کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: ''مسلمانوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ہندوؤں کو خوف زدہ کر کے اپنا الو سیدھا کیا''—— جس فوجی کمیشن نے بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی سماعت کی اس کے ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل میجر ایف - جے ہیریٹ کا بیان ہے کہ:

''ان مقدمات کی انتہائی معنی خیز حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی ہم نے تفتیش کی ہے مسلمانوں کی سازش کے آثار پائے ہیں، لیکن ایک بھی ایسی دستاویز ہاتھ نہیں لگی جس سے ظاہر ہو کہ ہندو بحیثیت فرقے کے ہمارے خلاف سازش کرتے رہے ہیں یا برہمنوں اور پجاریوں نے عیسائیوں کے خلاف جہاد کی پرچار کیا ہو''- (پی-سی-جوشی، انقلاب اٹھارہ سو ستاون، ص:۳۵/۳۶)

انگریزی حکومت کے یہ تمام مذکورہ اعلیٰ عہدیداروں نے مسلمانوں کے تعلق سے جو بیانات دیے ہیں، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے حقیقی داعی اور محرک مسلمان ہی تھے، جن کی قیادت میں ہندوستان کے ہندوؤں نے بھی اس جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جو جنگ ۱۹۴۷ء کی آزادی کی بنیاد بن گئی-

مسلمانوں کے لیے انگریزوں کا آخری تحفہ:- ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی ہندوستانی قومیت کے جذبے کے تحت کامیابی سے ہم کنار ہوئی، اس جنگ میں ہندوستانی خواہ جس مذہب کے ہوں، صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے- چونکہ تقریباً اس حقیقت سے تمام دانش ور اور مؤرخ اتفاق کرتے ہیں کہ یہ آزادی بھی پہلی جدوجہد آزادی ۱۸۵۷ء کا ہی نتیجہ تھی، جس کے حقیقی داعی اور محرک مسلمان تھے، اس لیے انگریز ملک سے جاتے جاتے نہ صرف ''تقسیم وطن'' کا زخم دے گئے، بلکہ ہندوؤں کو ہمیشہ کے لیے اقتصادی اور سماجی طور پر مستحکم کر گئے اور مسلمانوں کو بے دست وپا، مسلمانوں کے لیے یہ زخم اب ناسور بن چکا ہے، جس کی تکلیف سے وہ اب تک کراہ رہے ہیں- تلمیذ خلدون

تاریخی دستاویز کے حوالے سے ''انقلاب اٹھارہ سو ستاون'' میں مذکورہ بات کی یوں تصدیق کرتے ہیں:

''(انگریزی دور میں) سرکار کے تمام انتظامیہ اداروں میں مسلمانوں کا تناسب گھٹ کر چار پانچ فی صدی رہ گیا، جب کہ سو سال پہلے انہیں حکومت کی اجارہ داری حاصل تھی، یہی حال ان اعلیٰ اسامیوں کا ہے جہاں سرکار کے لطف وکرم کی تقسیم پر ہر وقت کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے، کم حیثیت کے عہدوں سے مسلمانوں کا اخراج اور بھی زیادہ ہے...... ہندو تعلیم کے میدان میں بہت آگے بڑھ چکے تھے اور سرکاری ملازمتوں اور تجارت میں اپنے قدم جما چکے تھے...... دونوں فرقوں کی غیر مساوی ترقی سے ہندو مسلم مسئلہ پیدا ہو گیا- اسی مسئلہ نے بعد میں ہندوستان کی قومی آزادی کی جدو جہد میں رخنہ ڈالا- انگریزوں نے اس مسئلے کو ہوا دی اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بالآخر یہ پاکستان کے قیام کا موجب ہوا''- (ص:۶۲)

اسی کے ساتھ ہی انگریزوں کی سازشوں اور آر-ایس ایس اینڈ کمپنی کی شعوری کوششوں سے مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا گیا کہ اس تقسیم کے حقیقی ذمہ دار وہی ہیں- نتیجۃً مسلمان احساس گناہ سے بوجھل ہو گئے اور آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ آزادی ہند کے حقیقی داعیوں کو اس طرح ''غدار وطن'' کے روپ میں کھڑا کر دیا گیا ہے کہ انہیں صفائی دینی مشکل ہو گئی ہے- دوسری طرف انگریزوں کی اقتصادی مار اور آزادی کے بعد حکومتی مناصب پر براجمان فرقہ پرست ہندوؤں کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں کی اقتصادی پوزیشن سچر کمیٹی کی حالیہ رپورٹ کے مطابق یہ بن چکی ہے:

''مختلف ریاستوں کے مسلمانوں کے حالات میں (اور ان مسلمانوں کے حالات میں جو اپنے آپ کو او-بی-سی اور دیگر زمروں میں شمار کرتے ہیں) قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے اور یہ کہ مسلم فرقہ ترقی کے عملاً تمام مظاہر میں خسارے اور محرومیوں سے دوچار ہے- درحقیقت زیر غور تمام اشاریوں کے

لحاظ سے مسلمانوں کی حالت کم وبیش ایس-سی/ایس-ٹی سے کچھ بہتر، مگر ہندو او-بی-سی، دیگر اقلیتوں اور عام ہندوؤں (بیشتر اعلیٰ ذات والے) سے بدتر ہے''- (سچر کمیٹی رپورٹ، ۱۲واں باب، بحوالہ: سی-پی-آئی کی نظر میں بھارت کے مسلمان، صفحہ:۵۸)

اب حال یہ ہے کہ آزادی کے علمبرداروں کے لیے اقتصادی طور پر باوقار زندگی گزارنا بھی مشکل ہے اور اپنے اوپر لگائے گئے ''غداری'' اور ''بے وفائی'' کے الزامات کی صفائی دینا بھی مشکل ہے- آج ہر مسلمان زبان حال سے گنگنا رہا ہے کہ ''بات کرنی ہمیں مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی''-



سیکولرائزیشن بنام اسلامائزیشن

ہندو عقیدے کا بنیادی اصول ''سرودھرم سمبھاوا'' ہے، یعنی تمام مذاہب سچے ہیں، ہندوازم کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ کثرت میں وحدت کو مانتا ہے، اس کے نزدیک حقیقت کی ظاہری ہیئت مختلف ہوتی ہے، مگر اندرونی حقیقت ایک، گویا ہندوازم کا عقیدہ انیکتا میں ایکتا کو دیکھنا ہے- اس عقیدے کی اشاعت مختلف ادوار میں ہندو حکمراں، دانش ور یہاں تک کہ کچھ نام نہاد مسلمان بھی کرتے رہے- کہا جاتا ہے کہ چوتھی صدی قبل مسیح کے راجا اشوک جو ایک بدھ دھرم کا پیروکار تھا، وہ بھی اسی نظریے کا حامی رہا کہ تمام مذاہب سچے اور برابر ہیں اور ان تمام کا احترام ضروری ہے- ہندوستان کے عہد وسطی میں اس کا علَم ''بھکتی تحریک'' Bhakti Movement نے اٹھایا- سولہویں صدی میں اکبر نے اسی نظریے کی حمایت میں فکری ارتداد کی مہم چلائی، ماضی قریب میں سوامی رام کرشن اور ان کے چیلے سوامی وویکا نند اسی عقیدے کے علم بردار رہے- بیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں مسٹر گاندھی آزادی وطن کی تحریک کے ساتھ اس عقیدے کو بھی فروغ دیتے رہے اور غیر مسلموں میں روحانیت کے بڑے علم بردار سمجھے اور پوجے جانے والے سائیں بابا بھی اسی نظریے کے حامی سمجھے جاتے ہیں- لیکن اسلام کا نظریہ اس آئیڈیالوجی کی ضد ہے...... مذہب کا تعلق متفقہ طور پر تین چیزوں پر ہے- عقیدہ، عبادت اور اخلاقی اقدار، اسلام میں عقیدے میں اختلاط، شرک کی دہلیز پر لاکھڑا کرتا ہے اور انکار، ارتداد کی سان پر چڑھا دیتا ہے- عبادت میں اختلاط، شرک کہلاتا ہے اور انکار کفر، اور اخلاقی اقدار میں آمیزش ایک مسلمان کا سررشتہ اپنی اصل اور ماضی سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے-

ساتویں صدی میں ہندوستان کے جنوبی ساحل پر عرب تاجروں کی آمد ورفت اور پھر دسویں صدی میں مسلم حکمرانوں کے ہندوستان کے اقتدار پر قبضے نے بڑے پیمانے پر اسلام کو پھیلنے کا موقع دیا اور صوفیہ نے اس پھیلاؤ اور وسعت کو استحکام عطا کیا- اس کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ صدیوں سے ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے معاشرتی اختلاط سے جہاں لاکھوں افراد کو اسلام قبول کرنے کی سعادت ملی، وہاں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے ذہن وفکر نے ہندوؤں کے مذہبی نظریات، ان کے رسم ورواج اور تہذیب واقدار کو بھی غیر شعوری طور پر قبول کیا، گویا............ع

خراب کرگئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ

تقسیم ہند کے بعد جب ہندوستان میں مسلمان اقلیتی پوزیشن میں آئے تو اس عقیدے کو گویا پاؤں پسارنے کا موقع مل گیا اور پھر اس نے تحریک کی شکل اختیار کرلی، ادھر عالمی سطح پر کمیونزم کی شکست کے بعد اسلام کی عالمگیر مقبولیت نے مغرب کی نیندیں اڑادیں اور پھر مغربی دنیا نے اسلام کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے مذہبی بنیاد پرستی Religious Fundamentalism کو عالمی امن کے لیے خطرہ بتاتے ہوئے مذہبی لادینیت Religious Secularism کا شوشہ چھوڑا، دونوں کا ہدف صرف اسلام اور مسلمان تھے جو اپنے نظریات میں کسی آمیزش اور عقیدے میں سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھے- تاریخ بتاتی ہے کہ اس آتشی نظریے کو فروغ دینے کے لیے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عالمی سطح پر مسلم دانش وروں اور علمائے دین کو بھی استعمال کیا گیا، مذہبی مفاہمت، بین المذاہب ہم آہنگی، روحانیت اور رواداری کی آڑ میں اس آئیڈیالوجی کو عام کرنے کے لیے مختلف تنظیمیں اور ادارے قائم کیے اور کرائے گئے، کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کیے گئے- بعض مسلمانوں نے اپنے ایمان وضمیر حکومت وقت کو رہن رکھ کر یہ کام انجام دیا، بعض نے اظہار دانش وری کے لیے اس کی تائید کی تو بعض مادی منفعت میں اپنی دستاروں اور قباؤں کو بتوں کے قدموں میں ڈال کر اس آگ میں کود پڑے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے-

دیگر اہل مذاہب کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک اسلامی نظریے کے منافی نہیں،

لیکن ہماری رواداری کی انتہا اگر عقیدے کے خاتمے کی تمہید بن جائے تو یقیناً تشویش ناک ہے اور حسن سلوک بڑھ کر ایمان وکفر کے فاصلے مٹا دے تو یہ ایک مسلمان کے لیے خطرے کا الارم ہے- مذہبی لادینیت کے ایسے نمونے آئے دن ہم دیکھتے رہتے ہیں، جو ہوش مند مسلمانوں کے لیے عبرت ہیں- اس فکری مغلوبیت اور مذہبی لادینیت کے چند نمونے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

مسلم دانش وروں اور علما کی فکری مغلوبیت: ۷/ مارچ ۲۰۰۶ء کو سنکٹ موچن مندر بنارس میں اچانک بم دھماکہ ہوا، جس سے پورے شہر میں خوف وہراس کا ماحول پیدا ہوگیا اور انتظامیہ سے لے کر ہندو عوام تک نے یہ مفروضہ قائم کرلیا کہ اس کے پیچھے کسی مسلمان کا ہاتھ ہے، اس مسئلے کو لے کر قریب تھا کہ وہاں ہندو مسلم فساد برپا ہوجاتا، مگر انتظامیہ اور پولس نے چوکسی برتی اور حالات دھیرے دھیرے نارمل ہوگئے- حالات کو مزید قابو میں کرنے اور ہندوؤں سے رواداری، محبت اور ہم آہنگی کا مظاہرہ کرنے اور اپنی مظلومیت کی صفائی دینے کے لیے وہاں کے بعض علما اور مسلم دانشوروں نے ایسی سرگرمیاں دکھائیں جن کا مذہبی سطح پر کوئی جواز نہیں نکلتا-

● اس وقت میرے پیش نظر ۱۳/ مارچ ۲۰۰۶ء کا ہندی روزنامہ ''دینک جاگرن'' ہے، اس میں نمایاں طور پر گیان واپی مسجد کے امام اور مفتی بنارس مولانا عبدالباطن نعمانی کی تصویر چھپی ہے، جو سنکٹ موچن مندر میں جاکر بتوں کے قدموں میں عقیدت سے کھڑے ہیں اور وہاں کے پجاری سے بتوں کا چڑھایا ہوا پرساد اور گنگا جل لے رہے ہیں، ہندوؤں کے ساتھ ان کی اس عقیدت ومحبت کو اخبار نے IkSgknZz dh felky یعنی دوستی اور امن کی مثال کہہ کر سراہا ہے-

سیکولرزم اور رواداری کے نشے میں چور رہنے والے مسلمان شرعی اعتبار سے اس حرکت کی کیا توجیہہ پیش کریں گے؟ اگر مفتی بنارس کا شرعی قلم دان اس محبت اور دوستی کا جواز پیش کرتا ہے تو پھر ان کے یہاں ایمان وکفر کا پیمانہ کیا ہے؟

● سیکولرزم اور آزادی اظہار کے نام پر عالمی سطح پر پیغمبر امن وامان ﷺ کی اہانت

اور مسلمانوں کو ذلیل کرنے کی جو جارحانہ مہم چل رہی ہے اس پر مشربی اور مسلکی اختلافات سے بالاتر ہوکر پوری دنیا کے مسلمان احتجاج اور نالہ وشیون کر رہے ہیں- یہ حقیقت مختلف جہت سے واضح ہوچکی ہے کہ پیغمبر اعظم کی اہانت مسلمانوں کے کسی عمل کا ردعمل نہیں بلکہ مذہبی عناد کا نتیجہ ہے، لیکن کچھ ایسے بھی کلمہ گو ہیں جو مسلمانوں پر ظلم وبربریت، پیغمبر اعظم کی اہانت اور اسلامی نظریات پر حملے کا ذمہ دار صرف اور صرف مسلمانوں کو ہی مانتے ہیں- ان میں ہندوستان میں سب سے پیش پیش مولانا وحیدالدین خاں ہیں، جو اپنے سیکولر مزاج اور دوسرے مذاہب کے ساتھ خاص رواداری، احترام، محبت اور حسن سلوک کی وجہ سے غیر مسلموں میں کافی مقبول ہیں اور مختلف حکومتوں کے منظور نظر بھی- ان کے سیکولر قلم سے نکلی ہوئی پچاسوں کتابیں اور مضامین پڑھ ڈالیے، اسلام پر ہو رہے حملے، حضور ﷺ کی توہین اور مسلمانوں پر ہو رہے ظلم وبربریت کے جواب میں وہ مسلمانوں کے لیے صرف ''صبر اور اعراض'' کا فارمولہ پیش کرتے ہیں، ملکی اور عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف غیر مسلموں کی کسی بھی زیادتی کو ان کی نادانی قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کے کسی بھی احتجاج اور ردعمل کو خود اسلام کی توہین، فسادات وانتشار کا سبب اور لغو وبے بنیاد مانتے ہیں- توہین رسالت کے مسئلے پر وہ اپنی ایک کتاب ''شتم رسول کا مسئلہ'' میں فرماتے ہیں کہ:

> ''انہیں دعوت کش سرگرمیوں میں سے ایک سرگرمی وہ ہے جو شتم رسول کے خلاف مسلمان ہر جگہ جاری کیے ہوئے ہیں اور جس کا ایک نمایاں مظاہرہ سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) کی اشاعت کے بعد ۱۹۸۹ء میں سامنے آیا ہے، اینٹی رشدی ایجی ٹیشن (رشدی کے خلاف محاذ) بلاشبہ لغویت کی حد تک غیر اسلامی ہے-'' (ص:۷)

ایک جگہ اور فرماتے ہیں:

> ''ناگوار باتوں پر مشتعل ہوجانے کی فہرست میں سب سے زیادہ نمایاں چیز وہ ہے جس کو ''ناموس رسول پر حملہ'' یا ''رسول کی شان میں گستاخی'' جیسے جذباتی الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے، اس نوعیت کی اگر کوئی بھی افواہ پھیل جائے تو اس

کے بعد مسلمان اس طرح بھڑک کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام تو درکنار عقل و ہوش سے بھی ان کا دور کا کوئی تعلق نہیں۔ مسلمانوں کا یہ لغو مزاج صرف اس لیے ہے کہ انہوں نے دعوت کا شعور کھو دیا ہے، دوسری اقوام کو وہ صرف اپنا قومی رقیب اور دنیوی حریف سمجھتے ہیں۔''

مزید آگے فرماتے ہیں: ''دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں پر وہ اسی طرح صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں جیسا کہ رسول اور اصحاب رسول نے اختیار کیا۔''
(ص:۸)

خاں صاحب کے مذکورہ سیکولر اقتباسات پر تبصرہ کرنے سے قبل میں قارئین کو یاد دلادوں کہ یہ وہی اسلامی دعوت کے سب سے بڑے علم بردار ہیں جنھوں نے ۱۹۹۷ء میں یہ بیان جاری کیا تھا کہ ''مسلمان سرسوتی وندنا کے مخالف نہیں۔'' اپنے نام نہاد دعوتی شعور کے یہ دعویدار ہندوؤں سے رواداری اور حسن سلوک میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ سرسوتی کی مورتی کے آگے پوجا ارچنا بھی کی اور ٹیکہ بھی لگوایا اور ''بندے ماترم'' (اے ما! میں تیرا بندہ ہوں) کے تعلق سے یہ بھی کہا کہ ''اس پر اعتراض واہیات اور لغو ہے۔'' (پوجا کی تصویر اور خاں صاحب کا یہ بیان آر ایس ایس کے اخبار ''پنچ جنیہ''، ۲۶ نومبر ۱۹۹۷ء میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے) قارئین کو یہ جان کر مزید حیرت ہوگی کہ مئی ۲۰۰۶ کے اپنے اداریے ''فکری ارتداد کی خطرناک مہم'' میں میں نے صدر جمہوریہ ڈاکٹر عبدالکلام صاحب کے کفر و ارتداد پر مشتمل جس سورت روحانی اعلامیہ کو فروغ دینے کے لیے بنائی گئی تنظیم ''فیورک'' کے خطرناک مقاصد سے پردہ اٹھایا تھا، اسی تنظیم فیورک کے ۲۲؍ بانی ممبروں میں سے ایک خاں صاحب بھی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ خاں صاحب کے سیکولر مزاج سے واقفیت کے بعد مذکورہ اقتباسات پر تبصرہ کرنا لغو ہو جاتا ہے۔ جس تنظیم کے وہ بانی ممبر ہیں اس کے مطابق ''تمام مذاہب سچے ہیں'، جب تمام مذاہب کی سچائی پر انہوں نے مہر تصدیق ثبت فرمادی ہے تو پھر آخر وہ کس مذہب کی ''دعوت'' کے لیے مسلمانوں کے عقل و شعور کے فقدان کا ماتم کر رہے ہیں؟ بات

کچھ نہیں صرف اتنی سی ہے کہ اقتدار میں رہنے والی قوم کم تعداد میں ہوکر بھی غالب رہتی ہے، مسلم حکمراں جب تک اقتدار میں رہے مسلمان بھی علمی، فکری، اقتصادی اور معاشرتی سطح پر غالب رہے، لیکن جب ان کے ہاتھوں سے زمام اقتدار گیا تو احساس شکست خوردگی اور کمتری نے انہیں فکری طور پر اتنا مغلوب کردیا کہ وہ سمجھوتے پر اتر آئے، پہلے پہل یہ سمجھوتہ سلوک اور رواداری تک رہا، یہاں تک تو ٹھیک تھا، لیکن تقسیم ہند نے جب اس احساس کمتری، شکست خوردگی، مغلوبیت اور احساس اقلیت کو دوآتشہ کیا تو پھر عام مسلمانوں کو تو جانے دیجیے بہت سے اسلامی اسکالر کہلانے والے اصحاب ریش و کلاہ اپنے ''عقیدے'' میں بھی سمجھوتے پر اتر آئے جس کے بھیانک نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔

● یونیفارم سول کوڈ کے مسئلے پر ماہر عمرانیات اور معروف سیاسی مبصر ڈاکٹر امتیاز احمد نے کچھ عرصے قبل ٹائمز آف انڈیا دہلی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

"It can only be justified on the ground of legal universality, namely, the view that people living within a country should as far as possible be governed a common law"

''یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا جواز ہمہ گیر قانون کی بنیاد پر پیش کیا جاسکتا ہے، یعنی اس تناظر میں کہ جب لوگ ایک ہی ملک کے اندر رہ رہے ہیں تو ایک ہی قانون کے تحت ان پر حکمرانی بھی ہونی چاہیے۔''

یہ ڈاکٹر صاحب نہیں ان کا احساس مغلوبیت بول رہا ہے، برسوں اکثریتی طبقے کے ساتھ زندگی گزارنے کے بعد وہ اس منزل پر آگئے ہیں کہ خدائی اور شرعی قانون سے دست بردار ہوکر وہ ایک بشری اور لادینی قانون کے تحت زندگی گزارنے کے لیے تیار ہیں، دوسرے لفظوں میں اکثریتی طبقے کی خوشنودی کے لیے وہ ہندوستان کی پارلیمنٹ کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ دستور ہند سے وہ دفعات ختم کردی جائیں جن میں اقلیتی طبقوں یا مسلمانوں کو مذہبی آزادی کے حقوق اور عائلی مسائل میں مذہبی قوانین کی رعایتیں دی گئی ہیں۔ اگر ہندوستان میں ان جیسے مذہبی شعور سے عاری مسلمانوں کی خواہش پر یونیفارم سول

کوڈ کا نفاذ ہو جائے تو پھر اس کے کتنے خطرناک نتائج سامنے آئیں گے اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا- مثلاً ہندوستانی عدالتیں زبانی طلاق کو تسلیم نہیں کریں گی اور ایک مسلمان زبانی طلاق دینے کے باوجود اپنی مطلقہ کے ساتھ رہ کر زندگی بھر حرام کاری کرتا رہے گا (جس کا ایک نمونہ پچھلے دنوں اڑیسہ کی نغمہ بی بی اور شیر محمد کے معاملے میں سامنے آیا) طلاق کے باوجود ایک مسلمان کو اپنی مطلقہ یا دوسرے لفظوں میں ایک اجنبی عورت کو تا حیات نان ونفقہ دیتے رہنا ہوگا- طلاق مغلظہ کے باوجود ایک مسلمان بغیر حلالہ کیے، مطلقہ کے ساتھ دوبارہ رشتہ استوار کر سکے گا، تعدد ازدواج کا شرعی قانون ختم کر دیا جائے گا اور دار القضا پر پابندی عائد کر دی جائے گی- آخر جب کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان حلال وحرام کا فرق مٹ جائے گا اور حق وباطل کا امتیاز ہی ختم ہو جائے گا تو پھر ان کے پاس مذہب کے نام پر رہ کیا جائے گا؟

● فروری ۱۹۸۹ء میں سلمان رشدی کی کتاب ''شیطانی آیات'' منظر عام پر آتے ہی پوری دنیا کے مسلمانوں کی روح کانپ اٹھی- دنیا کے کروڑوں مسلمان اس کتاب پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کرنے لگے اور مسلم ممالک نے احتجاجاً برطانیہ سے اپنے سفرا واپس بلا لیے- کتاب کے تعلق سے مسلمانوں کا نالہ وشیون تو الگ رہا، غیر مسلم مصنفوں اور صحافیوں نیز مغربی تبصرہ نگاروں نے بھی اس کتاب کو نہایت بازاری، عامیانہ، بوجھل، نا قابل فہم اور نا قابل مطالعہ کہا-

انگریزی کے معروف قلم کار مسٹر خشونت سنگھ کہتے ہیں کہ:

Even as a novel " The Satanic Verses"is not readable.

''ایک ناول کی حیثیت سے بھی ''شیطانی آیات'' مطالعہ کے لائق نہیں-''

ہندوستانی صحافی مسٹر ارن شرما اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

Third rate theme by a second rate author on a first rate paper.

''تیسرے درجے کی تھیم، دوسرے درجے کا مصنف اور اول درجے کا کاغذ-''

لیکن افسوس ہے کہ جب دنیا میں سب سے پہلے راجیو گاندھی کی سرکار نے اس کتاب پر اس وقت ہندوستان میں پابندی عائد کی تو اس پابندی کے خلاف چیخنے والے کوئی اور نہیں، ہندو مسلم ہم آہنگی اور مذہبی مفاہمت کے تصور میں زندگی گزارنے والے تین کلمہ گو پروفیسر مشیر الحسن وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار سابق ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ اور مشہور ترقی پسند ادیب اور کمیونسٹ شاعر علی سردار جعفری ہی تھے-

مسلم معاشرے پر فکری مغلوبیت کے نتائج: -اکثریتی طبقے کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط کی وجہ سے مسلم معاشرے پر ویسے ہی غیر شعوری طور پر ان کے عقائد، تہذیب اور روایات کے کافی اثرات پڑے، ''سرو دھرم سمبھاوا'' کی عملی تحریک نے ان اثرات کے نقوش نمایاں کیے اور بعض مسلم علما اور دانش وروں کی سماجی سطح سے عقیدے کی سطح تک سمجھوتے نے ان نقوش کو گہرے کر دیے، اب بھی ہندوستان کے کئی صوبوں میں عام مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت اور رواداری میں اپنی مذہبی ہیئت اتنی بگاڑ لی ہے کہ شرعی خوردبین سے دیکھنے کے بعد بھی ان کی اسلامی ہیئت پہچانی نہیں جاتی-

چند نمونے ملاحظہ کریں:

● صوبۂ اڑیسہ کی راجدھانی بھونیشور میں مسلم مچھیروں کا ایک بڑا طبقہ تقریباً پچھلے ۱۲/ سالوں سے بھگوان گنیش کی پوجا کر رہا ہے، وہ پوجا کے لیے مورتی کا اہتمام کرتے ہیں، پنڈال سجاتے ہیں اور پنڈال کے اندر مورتی کے سامنے اور مورتی کے جلوس میں قرآن بھی پڑھتے ہیں- یہ خبر جیسے ہی میڈیا کو ملی، خوشی سے ان کی باچھیں کھل اٹھیں، ان لوگوں نے ہندو مسلم بھائی چارہ کی عظیم مثال کے طور پر اس کو پیش کیا اور بالواسطہ اسلامی تصلب کا تمسخر بھی اڑایا- اس وقت ۱۳/ ستمبر ۲۰۰۵ء کا آن لائن اخبار ''مڈڈے'' Mid Day میرے سامنے ہے، اس میں پچھلے سال مسلمانوں کے ذریعے گنیش پوجا منائے جانے کے بعد اس اخبار نے یہ سرخی لگائی کہ Ganesh puja in a Mosque ''گنیش پوجا مسجد میں'' اس

کے بعد لکھتا ہے کہ:

Lord Ganesh is no longer a Hindu diety in Orissa. A mosque-like structure has been constructed as a marquee at puja pandal and the Quran has been chanted during the procession for immersion of the idol.This particular Ganesh puja was celebrated for 20 days.

''بھگوان گنیش اڑیسہ میں اب صرف ہندو کے ہی خدا نہیں، پوجا پنڈال ایک مسجد کے ڈھانچے کی شکل میں کھڑا کیا گیا اور مورتی کو بہانے کے جلوس کے دوران قرآن کی تلاوت کی گئی، یہ خاص گنیش پوجا ۲۰؍دنوں تک منایا گیا۔''

آگے لکھتا ہے کہ: ''مسلمانوں کا ایک طبقہ جس میں زیادہ تر مچھیرے ہیں بھگوان گنیش کی پوجا کا اہتمام کرتا ہے۔ انہوں نے اس کے لیے ایک کمیٹی بنام Jawan Matsya Byabasayi Sangh Puja Committee بنائی ہے جو اس عبادت کو پچھلے ۱۲؍سالوں سے کررہی ہے۔'' (ترجمہ انگریزی سے)

اس پوجا کمیٹی کے ایک رکن عابد حسین کا یہ کربناک انکشاف پڑھیے اور سر پیٹیے، وہ کہتا ہے کہ: جب خدا اس پنڈال میں ہوتا ہے تو ہم تمام ہندو رسوم کو انجام دیتے ہیں۔

آخر میں اخبار تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

''اڑیسہ میں ہندو اور مسلمانوں نے ہمیشہ بھائی چارہ کی عظیم مثال قائم کی ہے، مغربی اڑیسہ کے نارائن پور گاؤں کے مسلمان جگن ناتھ رتھ یاترا کا اہتمام کرتے ہیں اور مغربی اڑیسہ کے سنبل پور کے ہندو تعزیہ نکالتے ہیں۔''

(ترجمہ انگریزی سے)

● ممبئی اور مہاراشٹر کے دیگر علاقوں میں مسلمان بھی گنیش پوجا کا اہتمام بڑے جذبے سے کرتے ہیں، بلکہ مورتی کو سمندر میں بہانے کے لیے جو لاکھوں افراد کا جلوس نکلتا ہے اس کی قیادت بھی بعض جگہوں پر مسلمان کرتے ہیں۔

آن لائن انسائیکلوپیڈیا Wikipedia میں لکھا ہے کہ:

''ممبئی میں گن پتی کے جلوس کے دوران اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان کے درمیان تناؤ ہو جاتا ہے''

پھر آگے لکھتا ہے کہ: ''تاہم کچھ ایسے بھی مثالی مسلمان ہیں (یہاں تک کہ عیسائی بھی) جو گنیش پوجا میں شامل ہوئے، یہاں تک کہ ۱۰؍ستمبر ۲۰۰۵ء کو خاص طور پر ایک مسلمان نے گنیش منڈل کی قیادت بھی کی۔''

However, there are examples of Muslims (and even Chiristians) involved in Ganesh Chaturthi celebrations,as of 10th september 2005,a muslim headed this particular Ganesh mandal.

● ان کے علاوہ ہندوستان میں خاص طور پر مہاراشٹر اور راجستھان میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ہے جن کے یہاں عورتیں شادیوں میں منگل سوتر اور مانگوں میں سندور کا استعمال کرتی ہیں۔ ان کی شادیاں ہندو رسم و رواج کے مطابق انجام پاتی ہیں۔ ہندوستان کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والی مسلمانوں کی نئی نسل جن کی تعداد لاکھوں میں ہے، انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ایمان کی حد کہاں پر ختم ہو کر کفر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، وہ غیر مسلموں کے ساتھ رہتے رہتے بلا تکلف شراب نوشی کرتے ہیں، ہولی دیوالی مناتے ہیں اور ان کے ساتھ مندروں کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہوئے عار محسوس نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جس میں پڑھے لکھوں کی تعداد زیادہ ہے، غیر مسلم لڑکے لڑکیوں سے شادی کرنے میں تامل نہیں کرتا اور شادی کے بعد دونوں اپنے اپنے مذہب کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں جنہیں دنیا یکجہتی، رواداری، جمہوریت اور سیکولرازم سے تعبیر کرتے ہوئے عالمی امن کی بقا کا ضامن مانتی ہے۔ درگاہوں پر غیر اسلامی مراسم اس پر مستزاد جہاں ہاتھوں پر لال دھاگہ باندھنا، قبر کا طواف کرنا، صاحب مزار کی تصویر فروخت کرنا اور بعض جگہ درگاہ کی چوکھٹ پر ناریل پھوڑنا لوازم کی صورت اختیار کرتے جارہے ہیں۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ روحانیت کے نام پر مذہبی مفاہمت اور رواداری کا نعرہ بلند کرنے والے مسلم قائدین اور روحانی باباؤں کا مذہبی ضمیر اس فکری ارتداد کے بڑھتے

ہوئے طوفان پر کیا سرگوشی کرتا ہے؟ اگر اسے مزاج شریعت سے متحارب نہ تسلیم کرتے ہوئے جائز کہتا ہے، تو پھر ''فیورک'' جیسی تنظیمیں ضرور بننی چاہیے، جن کا منشور اسی ارتداد کو مہمیز لگانا ہے اور شرعی ذہنوں کو یرغمال بنا کر کفر کی دہلیز تک پہنچا دینا ہے- اس کے بعد انہیں اپنے موروثی عقائد کا نہ کوئی سبق یاد رہتا ہے، نہ دیرینہ روایات کا کوئی پاس اور نہ خاندان کی اعلیٰ قدروں کا لحاظ-

روحانیت اور تصوف کی صدیوں پرانی تاریخ میں آج تک ایسا کوئی صوفی یا روحانیت کا کوئی علم بردار نظر نہیں آتا جس نے بنام روحانیت بتوں کے چرنوں میں بے دریغی سے سجود نیاز لٹائے ہوں اور کعبہ کے ساتھ کلیسا و دیر سے بھی رشتہ استوار رکھا ہو- ہاں! یہ ضرور ہوا کہ ان کے جلو میں جو بھی کافر و سرکش آیا، انہوں نے اسے اسلام کا سچا پرستار بنا دیا، آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں تو روحوں کو عشق رسول کا متوالا بنا دیا اور ہاتھ پکڑ لیا تو آن واحد میں معرفت و تجلیات کے عرش پر بٹھا دیا- لیکن ہندوستان کے مخلوط معاشرے نے مسلم باباؤں کو روحانیت کا جو نیا جغرافیہ حوالے کیا ہے اس میں شریعت اسلامیہ کا نہ کوئی ہیکل سلامت ہے اور نہ توحید کا کوئی نظریہ محفوظ، بلکہ انہوں نے روحانیت اور تصوف کی ایسی تعبیر پیش کی ہے جہاں اسلام کفر سے بغل گیر نظر آتا ہے اور مسلمانوں کا مذہبی رشتہ مسجد سے بت کدے تک پھیل جاتا ہے-

سیکولرازم کا اصلی چہرہ:- پوری دنیا میں آزادی اظہار کے نام پر اسلام کی اہانت کی جا رہی ہے اور مذہبی تصلب کے بالمقابل مذہبی سیکولرازم کی تحریک چلا کر مسلمانوں کے مذہبی تصلب کو ختم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں- اس ضمن میں بے شمار مسلم دانش وروں، علما اور شاید عام مسلمانوں کو بھی یہ غلط فہمی ہے کہ ہندوستان سے لے کر مغربی دنیا تک اس تحریک کو فروغ دینے والے خود بھی سیکولر مزاج رکھتے ہیں اور اپنے مذاہب میں متصلب نہیں ہیں، جبکہ زمینی حقیقت اس کے برخلاف ہے- اس تحریک کا ہدف صرف اسلام اور مسلمان ہیں جبکہ وہ خود اپنے مذہبی نظریات، تہذیب و اقدار اور رسوم و رواج میں نہایت متشدد واقع ہوئے ہیں، ان کے مذہبی تشدد اور تصلب کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

● ۱۷ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو فرانس میں مسلم عورتوں کے اسکارف پہننے پر حکومت نے سخت پابندی عائد کر دی اور اسکول جانے والی مسلم بچیوں کو سر سے اسکارف ہٹانے پر مجبور کیا گیا، یہ کہتے ہوئے کہ یہ ایک خاص مذہبی شناخت اور علامت ہے جو سیکولرازم کے خلاف ہے، اس بے جا پابندی کو شیخ ازہر سید طنطاوی نے بھی حکومت فرانس کا حق بتایا اور کہا کہ French Government has the right to issue. لیکن مغربی اثرات کے زیر نگیں رہنے والے مسلم علما کو یہ نظر نہیں آیا کہ وہاں دوسری مذہبی علامتوں پر پابندیاں عائد نہیں کی گئیں، یہ بالکل حقیقت ہے کہ حکومت فرانس نے نہ تو عیسائیوں کے کراس Cross پر پابندی لگائی جسے وہ گلے میں ڈال کر گھومتے ہیں اور نہ یہودیوں کی ٹوپی Skullcap پر کسی طرح کی پابندی عائد کی، آخر یہ کون سا سیکولرازم ہے؟ فرانس کی اس دو رخی پالیسی پر وہاں کے مسلمانوں نے بھی شدید احتجاج کیا مگر حکومت کان میں تیل ڈال کر سوتی رہی-

کچھ عرصے پہلے جب پوپ جان پال دوم کی موت ہوئی تو فرانس کا قومی پرچم جھکا دیا گیا اور صدر فرانس Jacques Chirac اس کے جنازے میں شرکت کے لیے اٹلی بھی گئے، آخر فرانس جب ایک سیکولر ملک ہے اور وہاں کسی خاص مذہبی علامت کی گنجائش نہیں تو پھر ان مذہبی علامتوں کا مظاہرہ کیوں؟

حکومت فرانس کا سیکولرازم کے اس دوہرے رویے پر طنز کرتے ہوئے آن لائن بولیٹن Chippla.blogspot.com کہتا ہے کہ:

In french however,secularism is not only a movement but has of itself became a religion with a simple creed"no to all other religions"

فرانس میں سیکولرازم ایک تحریک ہی نہیں بلکہ ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے جس کا سادہ نظریہ ہے کہ وہاں ''دوسرے مذاہب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے''

● ہالینڈ بھی مغربی ممالک میں سے ایک ہے جو سیکولرازم کا بہت بڑا داعی اور مذہبی تصلب کا مخالف سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ جان کر حیرت ہوگی کہ جب یورپ کی مشترکہ کرنسی

''یورو'' Euro کو متعارف کرایا جانے لگا تو اس نے اس پر God zij met ons یعنی ''خدا ہمارے ساتھ ہے'' کندہ کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، جس پر دوسرے ممالک نے کہا کہ Religion it was said shuold have no place in the Euro. یورو میں مذہب کے لیے کوئی جگہ نہیں، لیکن ڈچ حکومت اپنے موقف پر اڑی رہی اور کامیابی حاصل کی۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب دوسرے مذاہب کے لوگ جن میں بعض ملحد بھی ہیں اور بعض دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی، سب ہی شامل ہیں تو پھر ان پر ڈچ حکومت اپنے مذہب کو کیوں تھوپ رہی ہے؟ آخر جب وہ اپنے مذہبی نظریے میں اتنے متعصب ہیں تو پھر دوسروں کے لیے سیکولرازم کا فارمولہ کیوں پیش کرتے ہیں؟ اور دوسروں کی مذہبی علامت پر پابندی کیوں؟

● ریاستہائے متحدہ امریکہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا سیکولر ملک، امن و بھائی چارگی کا علمبردار اور تصلب و تشدد کا مخالف بتاتا ہے، لیکن حالات بتاتے ہیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ مذہبی متصلب، متعصب اور دہشت گرد اگر کوئی ہے تو امریکہ ہی ہے، اس نے فیشن، تجارت اور اقتصاد کی آڑ میں پوری دنیا کو عیسائی اور یہودی نظریات، تہذیب و ثقافت اور روایات کو اپنانے پر اس طرح مجبور کر دیا ہے کہ پوری دنیا اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہی ہے۔ سر دست اس کے تعلق سے مجھے ایک ایسا انکشاف ہوا ہے جس سے ایک بار پھر امریکہ کے نام نہاد سیکولرازم کی قلعی کھل جاتی ہے۔

پوری دنیا میں اسلامی ممالک کے علاوہ ہفتے میں دو روز سنیچر اور اتوار کو سرکاری اور دفتری چھٹی رہتی ہے۔ اس دن سارے سرکاری و غیر سرکاری دفتر، اسکول کالجز اور عام کاروباری آفیسز بھی بند رہتے ہیں، میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ آخر سنیچر اور اتوار ہی کو پوری دنیا میں چھٹی کیوں ہوتی ہے، ہر ملک کی پالیسی، تہذیب اور سسٹم الگ ہے لیکن چھٹی سبھی ان ہی دنوں میں کرتے ہیں، آخر کیوں؟ اس کیوں کا جواب مجھے مل گیا۔

بائبل میں عیسائیوں کو اور انجیل میں یہودیوں کو کہا گیا ہے کہ وہ ہفتہ میں سنیچر کو چھٹی

رکھیں، اور عیسائی اتوار کو چھٹی رکھیں اور آرام کریں اور ان دنوں میں عبادت کریں، جس کے لیے Sabbath کا لفظ وہ لوگ استعمال کرتے ہیں، جس کا مطلب ہے

Day of rest every week which the Bible enjoins its followers to keep holy Saturday: as the day of rest for jews. Sunday : as the day of rest for the Chiristians.

(Advanced twentieth century, edition: 1997)

چنانچہ وہ لوگ ان دنوں چھٹی کرتے ہیں اور عبادت کے لیے چرچ بھی جاتے ہیں، اپنے اس مذہبی نظریے کو انہوں نے پورے ملک میں نافذ کیا اور پھر رفتہ رفتہ پوری دنیا نے اسے غیر شعوری طور پر اپنا لیا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو معمولی کاموں میں بھی اپنی مذہبی ہدایات پر عمل کرنا نہیں بھولتے بلکہ پوری دنیا کو ان پر عمل پیرا کرانے کے لیے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے وہ سیکولر کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ تو چند مثالیں ہیں جنہیں میں نے اپنی تحقیق و تفتیش کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے پیش کر دیا، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اس موضوع پر مکمل ریسرچ کیا جائے تو ایسے ایسے حقائق ہمارے سامنے آئیں گے کہ محسوس ہوگا جیسے ہماری ہتھیلی پر کسی نے جلتا ہوا انگار رکھ دیا ہو۔

غور کرنے کی بات:- سیکولرازم اور جمہوریت کا عالمی سطح پر متفقہ معنی تو یہ ہے کہ ''مذہب کے معاملے میں اسٹیٹ کا عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرنا اور لوگوں کو اپنے مذہب و عقیدے کی آزادی دیتے ہوئے صرف مشترک دنیوی امور کا انتظام و انصرام کرنا'' اور اسی مفہوم کے پیش نظر تمام جمہوری ممالک نے اپنے دستور اور آئین مرتب کیے، لیکن عملی طور پر اس کا مفہوم اب یہ بن گیا کہ جس قوم کے ہاتھ میں اقتدار رہے، اس کے علاوہ کسی اور کو اپنی مذہبی شناخت اور علامات باقی رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے میں اس فکری ارتداد کے طوفان کو روکنے کے لیے ہمیں مسلمانوں میں دینی بیداری اور مذہبی شعور بیدار کرنے کے لیے سخت جد و جہد کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہ ایک ایسا بھیانک طوفان ہے جو پورے مسلم معاشرے کو اپنی زد میں لینے کے لیے تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے، اور ہمارے علما، دانش

وران اور پیران مغاں، اتحاد، رواداری اور سلوک کے ساتھ عقیدے میں بھی سمجھوتے پر اتر آئے ہیں اور اتحاد مذاہب، احترام مذاہب اور رواداری مذاہب کے نام پر عقائد میں پختہ مسلمانوں کو سیکولر اور بے دین بنانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ مسلم معاشرہ پہلے ہی سے اپنوں کی نادانیوں اور مغلوبیت کے زیر اثر اس آگ میں جل رہا ہے، خدارا مزید اس آگ کو ہوا دینے کی کوشش نہ کی جائے!

❑❑❑

دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں

اسلامی آتنک واد کے مضمرات اور غیر مسلم دہشت گردی کا تاریخی جائزہ

۱۱ر جولائی کو شام میں آفس میں کام ختم کرنے کے بعد گھر جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ اچانک پسینے میں شرابور ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ ابھی دس منٹ کے اندر عروس البلاد ممبئی کی لوکل ٹرینوں میں مسلسل آٹھ بم دھماکے ہوئے جس میں کئی سو لوگ جاں بحق ہو گئے اور بے شمار شدید زخمی ہو کر اسپتالوں میں داخل کر دیے گئے، یہ سنتے ہی بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی اور دل کی دھڑکن خون میں لتھڑی ہوئی انسانی لاشوں کے تصور سے اپنی طبعی رفتار سے دوگنی ہو گئی— اس المناک خبر کے ساتھ ہی پورا ملک ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ پر کان اور آنکھ لگائے بیٹھ گیا اور ان دل دوز مناظر کو سننے اور دیکھنے کے بعد غم و اندوہ میں ڈوب گیا، ادھر دھماکوں کے بعد مذہبی اور نسلی تفریق سے بالاتر ہو کر انسانیت کی امداد رسانی کے لیے ممبئی کے علاقائی عیسائیوں، ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں نے جو کردار نبھایا، اس نے ایک شب کے لیے مذہبی منافرت کا کھیل کھیلنے والوں کی سیاسی بساطیں الٹ کر رکھ دیں۔

ان دھماکوں میں مرنے اور زخمی ہونے والے بڑی تعداد میں ہندو بھی تھے، سکھ و عیسائی بھی اور مسلمان بھی، اس لیے اندھیرے میں ان دہشت گردانہ کارروائیوں کے پیچھے کوئی مذہبی ہاتھ تلاش کرنے کی بجائے پورا ملک تھوڑی دیر کے لیے اس مشترکہ غم کو بھول کر ممبئی والوں کی انسانیت کی گن گان کرنے لگا— لیکن افسوس اس یکجہتی کا تسلسل بہت دیر تک قائم نہیں رہا، ویسے بھی ہندوستان کی ہتھیلی پر سرحد کی سیدھی لکیر کھینچنے کے بعد دست شناسوں نے

موجودہ ہندوستان میں قومی یکجہتی کے مناظر بہت کم ہی دیکھے ہیں،تو پھراس دورانیے پر شکوہ کیسا؟ ابھی اس خونی کھیل کو گزرے ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ تفتیش اور کسی سراغ کے بغیر یکا یک ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ سے یہ شور اٹھتا ہے کہ ''اس کے پیچھے اسلامی آتنک واد کا ہاتھ ہے، شک کی سوئی لشکر طیبہ اور سیمی کی طرف گھوم رہی ہے، مسلم دہشت گردوں سے نپٹنے کے لیے پوٹا کا نفاذ بہت ضروری ہے'' پھر کیا تھا، مذہبی منافرت کا جن بوتل سے باہر آجاتا ہے، ابھی صبح کا اجالا پھیلا بھی نہ تھا کہ سیاسی بساطیں پھر سے بچھ جاتی ہیں اور مسلم علاقوں پر پولس کا قہر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے، ان علاقوں میں بڑے پیمانے پر کومبنگ آپریشن کے بعد بڑی تعداد میں بے قصور مسلمانوں کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا، مدرسوں کا حسب ونسب چیک کیا جانے لگا، مسجدوں کے ذمہ داروں کو پولس اسٹیشن طلب کر کے زدوکوب کیا جانے لگا اور پورے ہندوستان میں ہائی الرٹ کے نام پر مسلمانوں خاص طور پر اصحاب کلاہ وریش کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے انہیں جگہ جگہ پریشان کیا جانے لگا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے-

تعبیر کی غلطی:-دنیا میں مزاحمتی کاروائیوں کی تاریخ جسے حکومتی اور میڈیائی زبان میں ''دہشت گردانہ کاروائیوں'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، صدیوں پرانی ہے-اس تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دنیا میں ان مزاحمتی یا بلفظ دیگر دہشت گردانہ کاروائیوں کے لیے جتنی بھی تنظیمیں منظر عام پر آئیں ان کی بنیاد مذہبی منافرت پر نہیں بلکہ سماجی محرومی، معاشی بدحالی، نسلی اور علاقائی تشخص کے اصرار اور ظلم و بربریت پر ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا ہدف ملکی امن کو خراب کرنا ہوتا ہے اور ان کی مزاحمتی کاروائیوں کی زد میں آنے والا کوئی ایک خاص طبقہ نہیں ہوتا بلکہ پوری انسانیت ہوتی ہے، تاکہ ان کی آواز اربابِ حکومت سن سکیں اور ان کی مانگیں پوری کی جاسکیں—اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلم تنظیموں کی مسلح کوششوں اور کاروائیوں کے نتیجے میں مسلمان نہیں مارے جاتے، حالیہ ممبئی دھماکوں کی زد میں مسلمان نہیں آتے اور مسجدوں کے اندر یہ دھماکے نہیں کیے جاتے-اگر القاعدہ، لشکر طیبہ، حرکۃ المجاہدین اور جیشِ محمد جیسی مسلم تنظیموں کا ڈانڈا مذہبی منافرت سے جوڑ کر ملک و

بیرون ملک میں ہونے والی ان کاروائیوں کو''اسلامی آتنک واد'' کہا جاتا ہے تو پھر ببر خالصہ، نکسل وادیوں، ماؤنوازوں، ایل ٹی ٹی ای، ناگا باغیوں اور اُلفا کی دہشت گردانہ کاروائیوں کو''ہندو آتنک واد، عیسائی آتنک واد یا سکھ آتنک واد'' کیوں نہیں کہا جاتا؟

ان مزاحمتی تنظیموں میں کسی کی بھی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، ان کی تشکیل کی بنیاد مذہبی تشخص پر نہیں ملتی-القاعدہ کا قیام مشرقِ وسطیٰ میں امریکی بربریت کا نتیجہ ہے-ہندو پاک میں سرگرم مسلم باغی تنظیموں کا وجود ریاستِ کشمیر کی تحریک آزادی کی وجہ سے ہے-ببر خالصہ اور پنجاب میں سرگرم دوسری سکھ تنظیموں کا قیام''خالصتان'' کی مانگ پر ہے-شمال مشرقی ہندوستان میں ناگا ہتھیار بند گروہ کی آتنک وادی سرگرمیاں علاقائی علیحدگی کے سوال پر ہے-آسام میں اُلفا کی باغیانہ کاروائیاں نسلی و علاقائی تشخص کی بنیادوں پر ہیں اور صوبہ بہار، بنگال، مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ میں نکسل وادیوں کا قہر سماجی محرومی کا شاخسانہ ہے-اسی طرح کسی بھی باغی تنظیم کی تشکیل کی وجہ جاننے کی کوشش کی جائے تو اس کی بنیاد نسلی و علاقائی تشخص، سماجی محرومی، معاشی بدحالی اور ظلم و بربریت پر ہی ہوگی، مذہبی تشخص یا منافرت پر نہیں— لیکن ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا ان دہشت گردانہ کاروائیوں کو امریکی عینک سے دیکھنے کی عادی ہو چلی ہے، جس نے پروفیسر سیموئل کی''تہذیبی تصادم'' Clash of Civilization کی تھیوری کو اپنے ملک کی خارجہ پالیسی کا اٹوٹ حصہ بنالیا ہے-اس کے نزدیک ایک طرف عالمی امن وامان کو چاٹ جانے والی مسلم درندہ قوم ہے اور دوسری طرف باقی ماندہ مہذب قومیں، اس لیے اس تصادم کے نتیجے میں مسلمانوں کو معاشی، مذہبی، علاقائی اور سماجی سطح پر مفلوج کر دیا جائے تاکہ دنیا کو خطرے سے بچایا جاسکے-

اس تھیوری پر عمل کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو ہر سطح پر مفلوج بنانے کی امریکی کوشش تو کامیاب ہوتی نظر آتی ہے، لیکن اس کی وجہ سے دنیا کے بہت سے ملکوں کو داخلی اور خارجی سطح پر نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے، خود ہندوستان میں حکومت اور میڈیا کا اس تھیوری پر عمل کرنے کی وجہ سے ملک کی سالمیت اور ترقی کو کافی نقصان پہنچا ہے-اس تھیوری نے حکومت کی توجہ بہت سی دوسری غیر مسلم دہشت گرد تنظیموں کی طرف سے ہٹادی جو پورے ملک میں آزادی

کے ساتھ دہشت پھیلا کر ملک کی ترقی اور سالمیت کو زک پہنچا رہی ہیں اور اپنی مسلح اور افرادی قوت کو بڑھا کر اپنا دائرہ وسیع تر کرتی جا رہی ہیں، جب کہ حکومت ان کارروائیوں کے بعد تفتیش کیے بغیر مسلم دہشت گردی کا رونا رو رہی ہے اور پڑوسی ملک پر اپنا بخار اتار رہی ہے— مزاحمتی سرگرمیوں کے خلاف امریکی پالیسی پر عمل کرنے کی وجہ سے دوسرا نقصان ہمارے ملک کو یہ ہو رہا ہے کہ اقلیتوں کے خلاف نفرت رکھنے والی سیاسی اور نیم سیاسی پارٹیاں اس طرح کی دہشت گردانہ کارروائی کر کے اس کی ساری ذمہ داری مسلم تنظیموں پر ڈال رہی ہیں اور اقتدار کی ہوس میں سیاسی روٹی سینک رہی ہیں- گجرات کے فسادات اور حالیہ ممبئی بم دھماکوں کا تجزیاتی مطالعہ ہمارے اس نظریے کی توثیق کرتے ہیں اور ماضی میں اکشردھام مندر پر حملہ، جامع مسجد اور عین عید الفطر سے قبل بم دھماکے ہمارے اس نظریے کو تقویت پہنچاتے ہیں-

دہشت گردانہ کارروائیوں کا سرا اسلام اور مسلمانوں سے جوڑ کر اپنی داخلی نفرت کو تسکین یا امریکی مفادات کو تقویت پہنچائی جا سکتی ہے، لیکن ان کارروائیوں کو ختم نہیں کیا جا سکتا- انہیں ختم کرنے کے لیے حالات واسباب کا معروضی جائزہ لے کر ان کے تدارک کی ضرورت ہے-

عالم اسلام دو حصوں میں منقسم: اسلامی دنیا اس وقت واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے، ایک طبقہ اہل توہب (وہابیوں، اہلِ حدیث یا سلفیوں) کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ دوسرا طبقہ اہلِ تصوف (اہلِ سنت و جماعت) کے نظریات کا حامی اور پیروکار ہے- ۱۷۴۴ء میں جزیرۂ عرب کے ایک علاقے نجد سے شیخ عبد الوہاب نجدی نے توحید خالص کے تحفظ کے نام پر برسوں سے مروج اسلامی رسوم و روایات کو شرک قرار دیتے ہوئے علاقائی سطح پر اپنا اصلاحی آپریشن شروع کیا اور بنام تحفظ توحید مسلمانوں میں متشددانہ اور تصوف مخالف نظریات کی تبلیغ شروع کی- ابتداً اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لیکن سعودی حکمراں شاہ محمد ابن سعود نے جب اس نظریے کا علم اپنے ہاتھوں میں لیا تو نظریاتی قتل و غارت گری کی اس تحریک کو پاؤں پھیلانے کا پورا موقع ملا، شاہی محل میں پروان چڑھنے والی اس تحریک نے پورے سعودیہ میں طوفان برپا کر دیا، آثار رسول وصحابہ، تبرکاتِ رسول، گنبد و

مینارے جو اسلام کی مقدس ہستیوں کی آرام گاہوں کے علاماتی نشان تھے ان پر بلڈوزر چلا دیے گئے، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثار صحابہ اور اہلِ بیت اطہار کے کاشانوں کو ہوٹلوں، پارکوں اور باتھ رومز میں تبدیل کر دیا گیا، تاکہ وہاں دنیا کے کروڑوں مسلمان حاضر ہو کر اپنی مذہبی عقیدتوں کا خراج نہ پیش کر سکیں (کیونکہ یہ ان کی شریعت میں کفر و شرک کو مستلزم تھا) اور خالص توحید کے نام پر مذہبی تشدد اور جارح عقائد پر مبنی لیٹریچر تیار کرائے گئے اور پوری دنیا میں اس کی تبلیغ کے لیے شاہی خزانوں کے دہانے کھول دیے گئے- ہندوستان میں انیسویں صدی کے نصف اول میں اس تحریک کی نمائندگی شاہ اسماعیل دہلوی نے کی، اور محمد ابن عبد الوہاب نجدی کی لکھی دل آزار اور گمراہ کن نظریات پر مبنی کتاب ''التوحید'' کے مشمولات اور فکر کو نئے رنگ و آہنگ میں ڈھال کر ایک نئی کتاب ''تقویۃ الایمان'' تیار کی جس نے پورے برصغیر میں آگ لگا دی— اور پھر اس نظریاتی جنگ نے پورے عالم اسلام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا- پچھلی ایک صدی میں نجد سے اٹھی اس وہابیائی جماعت کے بطن سے کئی جماعتوں نے جنم لیا، جو اہلِ حدیث، سلفی وغیرہ ناموں سے جانی جاتی ہیں- دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ایک صدی میں اس وہابیائی تحریک سے جب کوئی نئی جماعت پیدا ہوئی اس نے تشدد میں اپنی پچھلی جماعت کو پیچھے چھوڑ دیا، جس کی آخری کڑی ''القاعدۃ'' ہے، جس کی اسلام مخالف اور انسانیت سوز سرگرمیوں نے اسلام اور مسلمانوں کے تئیں غیر مسلم دنیا کا زاویۂ نظر ہی بدل کر رکھ دیا- ان کے نزدیک چند ہزار افراد جو ان کی فکر و نظر سے منسلک ہیں، وہ مسلمان ہیں باقی پوری دنیا کافر و مشرک اور واجب القتل ہے-

اس تاریخی حقیقت کے جان لینے کے بعد مسلم تنظیموں اور ان کی مزاحمتی سرگرمیوں کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میڈیا میں ''اسلامی آتنک واد'' کی اصطلاح کا چلن، اسلام کے تعلق سے عام ذہنوں میں متشددانہ نظریات کی سوچ اور عام مسلمانوں کے بارے میں شکوک وشبہات کا رواج صرف امریکی پالیسی یا مذہبی منافرت پر نہیں ہے بلکہ خود مسلم تنظیمیں بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہیں، جو اپنی سماجی محرومی، معاشی بدحالی، علاقائی و نسلی تشخص اور ظلم و بربریت کے نتیجے میں اٹھائے

گئے ہتھیاروں کو مذہب کے کندھے پر رکھ کر چلا رہی ہیں تا کہ انہیں اسلامی دنیا اور کروڑوں مسلمانوں کی حمایت حاصل ہو سکے— حال ہی میں ۲۸ رجولائی کے انگریزی اخبار ''ٹائمز آف انڈیا'' میں اسامہ بن لادن کے دایاں ہاتھ اور القاعدہ نمبر ۲ کہلانے والے ایمن الظواہری کی ایک اپیل ''الجزیرہ'' چینل کے حوالے سے شائع ہوئی، جس میں انہوں نے پوری دنیا کے مسلمانوں کو اسرائیل کے خلاف جنگ کرنے کی دعوت دی ہے، اس دعوت کی اپیل میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

''یہ ایک جہاد ہے جو خدا کے لیے ہے اور یہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اسلام اسپین سے لے کر عراق تک غالب نہیں آجاتا، جس کے لیے ہم ہر جگہ حملے کریں گے''

It is a jihad for the sake of God and will last till our religion prevails Spain to Iraq . We will attack everywhere.

یہی وہ سوچ ہے جو میڈیا کو ''اسلامی آتنک واد'' کہنے کے لیے مجبور کرتی ہے اور مذہبی منافرت رکھنے والوں کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مقوی غذا کا کام کرتی ہے۔

یہاں قارئین کو میں ایک اہم نکتے کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، کہ جس امریکی ظلم و بربریت کے خلاف ''القاعدہ'' اور اس کی حلیف تنظیمیں آسمان سر پر اٹھائی ہوئی ہیں، اسی امریکہ کے مفادات میں بلاواسطہ اور بالواسطہ یہ کل بھی کام کر رہی تھیں اور آج بھی کر رہی ہیں اور لطف کی بات یہ بھی ہے کہ دہشت گردی اور مذہبی تشدد کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے راتوں کی نیند حرام کرنے والے امریکہ بھی اسی ملک (سعودی عربیہ) کا سب سے بڑا حلیف اور ہمدرد ہے جہاں سے ان متشدد جماعتوں کا ظہور ہوا۔ ۸۰ء کی دہائی میں روس کو افغانستان سے باہر نکال کر ساؤتھ ایشیا پر اپنا سیاسی تسلط جمانے کے لیے امریکہ نے ہی ''القاعدہ'' کو افغانستان پہنچایا اور علاقائی حمایت کے لیے طالبان کو پیدا کیا اور انہیں پردے کے پیچھے سے کمک پہنچا کر ان سے اپنا مقصد پورا کیا۔ ۹۰ء کی دہائی میں مشرق وسطی پر اپنا تسلط قائم کر کے اسرائیل کو فوجی قوت پہنچانے اور پٹرول پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے لیے

عراق پر حملے کیے، اول الذکر مقصد میں کامیابی کے بعد اس نے ہندو پاک کو اپنا نظریاتی ہمنوا بنایالیا، لیکن جب یہی طالبان اور القاعدہ اس کے لیے گلے کی ہڈی بن گئے اور عراق پہ حملے کے باوجود مقصد میں کامیابی نہیں ملی تو اس نے انسانیت سوز ہتھیار Mass Distruction رکھنے کے الزام میں عالمی برادری اور اقوام متحدہ کی رضامندی کے بغیر دوبارہ ۲۰۰۳ء میں عراق پر ہلہ بول دیا اور طالبان کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے (کیوں کہ وہ امریکہ کے لیے سر درد بن چکے تھے) افغانستان پر حملہ کر دیا۔ پچھلے دنوں لبنان پر اسرائیلی بمباری اور وحشیانہ مظالم میرے مذکورہ دعوے کو دلیل فراہم کرتے ہیں اور غالباً اسی لیے امریکہ اپنی فوج عالمی مذمت کے باوجود ہٹانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے بعد اس کا نشانہ ایران اور شام ہیں تا کہ پورے مشرقِ وسطی پر اس کا کنٹرول ہو سکے— اب وہ اسی القاعدہ اور اس کی حلیف تنظیموں کو ختم کرنے کے نام پر خود ہی حملے کرواتا ہے اور پھر ان کے تار ان تنظیموں سے جوڑ کر اپنے مفادات حاصل کرتا ہے، ۲۰۰۲ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے جس کی طرف خود امریکی اور مغربی ماہرین نے اشارے کیے ہیں۔

کئی دہائی قبل ہی پوری دنیا بالخصوص مغربی دنیا کے سامنے اہل تصوف کا اعتدال اور اہلِ توہب کی بے راہ روی، گمرہی اور متشددانہ نظریات اس قدر واضح ہو چکے تھے کہ انہیں اپنے خطرناک عزائم اور سیاسی و مذہبی مفادات کے لیے ان دو طبقوں میں سے اہل توہب کے انتخاب میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی، اس لیے اس طبقے کو مغربی دنیا خصوصاً امریکہ نے کل بھی استعمال کیا اور آج بھی کر رہا ہے، صرف طریقۂ استعمال تبدیل ہوا ہے ورنہ کل انہیں گود میں بٹھا کر استعمال کر رہا تھا اور آج ان کے کندھوں پر بیٹھ کر اپنے مفادات حاصل کر رہا ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ بڑے پیمانے پر پکڑے جانے والے تخریب کار کہیں عقیدے کی سطح پر اور کہیں فکری سطح پر اسی تحریک کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔

ابھی ممبئی دھماکوں کے بعد بڑے پیمانے پر پولس نے جن مشتبہ لوگوں کو ماضی میں ان کے تخریبی رویے کی بنیاد پر گرفتار کیا ہے، ان میں اکثریت کا تعلق بھی وہابیائی تحریک اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی جماعتوں سے ہی ہے۔ ان گرفتار کیے گئے افراد میں ضلع

بیڑ مہاراشٹر کے رہنے والے دو افراد سید ذبیح الدین اور محمد فیاض بھی تھے، ان دونوں کا نام اس وقت ریکارڈ میں آیا جب ۹ رمئی کو ایلورا (مہاراشٹر) کے قریب بڑے پیمانے پر RDX پکڑا گیا، یہ دونوں ہی جماعتِ اہلِ حدیث کے ممبر ہیں، ان کے تعلق سے تمام تر تفصیلات ۲۳ رجولائی کے سنڈے ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوئی ہیں، اس میں ایک مسلم نامہ نگار نے تبصرہ کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا ہے کہ ''ممبئی بم دھماکے میں بنیادی طور پر یہ دونوں بھی مشتبہ ہیں اور کہا جاتا ہے کہ اس کام کے لیے ان دونوں کی ذہن سازی جماعت اہلِ حدیث نے ہی کی تھی''

They are key suspects in Mumbai Blasts.And said to have been indoctrinated by Ahle Hadees.

تبصرہ نگار اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتے ہوئے آگے لکھتا ہے کہ:

''سیمی اور لشکر طیبہ سے دونوں دوستوں کی قربت اہلِ حدیث کے توسط سے ہوئی۔ لشکر طیبہ کے بارے میں یہ یقین سے کہا جاتا ہے کہ اس کے مذہبی نظریات وہابیائی تحریک سے ماخوذ ہیں''

The two friends seem to have got close to SIMI and LeT through their Ahl-e-Hadees connection— LeT is belived to draw its religious moorings from the Wahabi-Style sect.

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ وہابی تحریک کے متشددانہ رویے اور ان کے دین کی خودساختہ تعبیرات نے ہی بنام جہاد دنیا میں انہیں قتل و غارت گری پر آمادہ کیا، جس نے اسلام کو ملزم کے کٹہرے میں کھڑا کردیا اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو مشتبہ بنادیا ہے، حالانکہ جماعتِ اہلِ حدیث کے ذمہ داران اپنے آفس میں بیٹھ کر ان دہشت گردانہ کاروائیوں سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں، تھوڑی دیر کے لیے اس لاتعلقی کو ہم تسلیم کر بھی لیتے ہیں، لیکن اس تاریخی اور زمینی حقیقت سے وہ بھی انکار نہیں کرسکتے کہ آج دنیا میں جتنی بھی دہشت گرد تنظیمیں کام کررہی ہیں ان تمام کا تعلق عقیدے کی سطح پر نہ سہی کم از کم فکری سطح پر انہی جماعتوں سے ہے جن کا سرشتہ وہابیائی تحریک سے جاملتا ہے۔

دہشت گرد صرف مسلمان نہیں: وہابیائی تحریک، امریکی پالیسی اور میڈیائی پروپیگنڈہ، یہ وہ تثلیث ہے جس نے ممبئی بم دھماکوں کے بعد مسلمانوں کے تعلق سے ایک دل آزار شوشہ چھوڑا ہے کہ:

''تمام مسلمان دہشت گرد نہیں لیکن تمام دہشت گرد مسلمان ہیں''

All Muslims may not be terrorists, but all terrorists are Muslims.

تعبیر کے فرق سے دلوں کی کدورت نہیں چھپائی جاسکتی، اس جملے کو کسی طرح بھی کہا جائے، برق بے چارے مسلمانوں پر ہی گرتی ہے۔ مگر اس تثلیث کے باوجود یہ زمینی حقیقت عام نگاہوں سے اوجھل ہے کہ آج بھی دنیا خصوصاً ہندوستان میں جتنی بھی باغی اور دہشت پسند تنظیمیں کام کررہی ہیں ان میں اکثریت ہندو، عیسائی اور سکھ تنظیموں کی ہے۔ ہندوستان میں کشمیر ہی ایک ایسی ریاست ہے جہاں آزادی کشمیر کے نام پر مسلم تنظیمیں ہتھیار اٹھائی ہوئی ہیں، جب کہ حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے تقریباً 600 اضلاع میں سے 150 ضلعوں اور بیسیوں ریاستوں میں ہندوؤں، عیسائیوں اور سکھوں کی، ببر خالصہ، نکسل واد، ماؤنواز، اُلفا، ایل ٹی ٹی جیسی دہشت پسند تنظیمیں سرگرم ہیں، ان تنظیموں میں ایک بھی مسلمان شریک نہیں، ریاست کشمیر میں سرگرم دو ایک مسلم تنظیموں اور ہندوستان کی دیگر غیر مسلم تنظیموں میں صرف فرق اتنا ہے کہ وہ بڑے شہروں میں ہی کبھی کبھار اپنی دہشت گردانہ کاروائی کرتی ہیں اور دنیا کی نگاہوں میں آسانی سے آجاتی ہیں، جبکہ مذکورہ غیر مسلم تنظیموں کی دہشت گردی کا دائرہ چھوٹے شہر، قصبے اور دیہات ہیں بلکہ کئی ریاستوں میں کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جہاں ان کی اپنی متوازی حکومت Parallel Government چل رہی ہے، وہاں ہندوستان کا قانون نہیں ان کے اپنے خودساختہ اصول چلتے ہیں، جہاں ہندوستانی پولیس بھی قدم رکھتے ہوئے گھبراتی ہے، انہوں نے اب تک ہندوستان کے ہزراوں کلومیٹر کے دائرے میں ان گنت پولیس اسٹیشنوں پر حملے کیے، ہزاروں بے گناہ شہریوں کو مارا، کروڑوں کا صرفہ لوٹا، حکومتی اداروں کو نشانہ بنایا اور ان کی املاک پر قبضہ کرلیا، ایسے میں یہ کہہ کر کہ ''تمام دہشت گرد مسلمان ہیں'' حقیقت سے آنکھیں

چرا کر دنیا میں مذہبی منافرت کو ہوا دی جاسکتی ہے لیکن دہشت گردی کا خاتمہ کر کے امن وامان کی طرف پیش قدمی نہیں کی جاسکتی۔

یہاں اگر دہشت گردی اور مزاحمت کی ملکی تاریخ پر بھی نظر ڈالی جائے تو ماضی میں کوئی ایسی مسلم تنظیم یا فرد نظر نہیں آتا جس نے حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا کر بے قصور عوام کو اپنے مفادات کا نشانہ بنایا ہو بلکہ بغاوت اور دہشت پسندی کی یہ خونی تاریخ بھی ہندوؤں، عیسائیوں اور سکھوں کے نام ہی منسوب کی جائے گی۔

● ہندوستان میں اجتماعی دہشت گردی کی پہلی صورتِ حال ۱۹۴۰ء میں اس وقت سامنے آئی، جب ہندوستانی ریاست ناگالینڈ اور میزورم میں علاقائی ہندوؤں اور عیسائیوں نے ناگا ہتھیار بند گروہ بنا کر عموماً پورے ملک اور خصوصاً مذکورہ ریاست کو علیحدہ ملک کے مطالبہ پر اپنی باغیانہ سرگرمیوں کا ہدف بنایا، ان کی تخریبی کاروائیوں سے پریشان ہوکر ہندوستانی حکومت اور نیشنلسٹ کونسل نے وہاں کے عام شہریوں کے ساتھ سمجھوتہ کیا اور علاقائی کونسلوں کو بہت سے حقوق دیے۔ اس سمجھوتہ کے بعد ناگا باغیوں کی دہشت گردانہ سرگرمیوں میں بہت حد تک کمی آئی لیکن اب بھی ان کے کچھ مطالبات ہیں جن کی وجہ سے ان کی مزاحمتی سرگرمیاں جاری ہیں، اسی کے نتیجے میں ۱۹۹۲ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک کے درمیان صرف آٹھ سالوں میں 595 شہری، 225 سیکورٹی جوان اور 866 ناگا باغی مارے گئے ہیں، جب کہ کروڑوں کی سرکاری وغیر سرکاری املاک کا نقصان بھی ہوا ہے۔

● آسام میں ۱۹۷۹ء میں غیر آسامیوں کی آمد کو لے کر ''آسام تحریک'' شروع ہوئی (کیوں کہ آسامی قبائل اقلیت میں تبدیل ہو رہے تھے) چھ سالوں کی دہشت گردانہ کاروائیوں کے بعد ۱۹۸۵ء میں ''آسو'' نے سمجھوتہ کیا اور آسام گن پریشد بنا کر الیکشن لڑا، بوڈو تحریک اسی کا نتیجہ ہے، اس نے شروع میں علیحدہ بوڈولینڈ کی تحریک چلائی یہاں تک کہ حکومتی سمجھوتے میں بوڈو کونسل کے قیام کے بعد یہ تحریک سرد پڑی حالانکہ چھوٹی چھوٹی شکلوں میں اب بھی یہ موجود ہے۔

● آسام تحریک میں اہم کردار ادا کرنے کے لیے ۱۹۷۱ء میں اُلفا کی بنیاد پڑی، اس

کا ابتدائی مقصد آسام کو ہندوستان سے آزاد کرا کر ایک سوشلسٹ صوبے کا قیام تھا، مگر اس کی دہشت گردانہ سرگرمیوں کے باوجود یہ تحریک کئی وجہوں سے کامیاب نہیں ہو پائی، ان وجوہات میں ایک بڑی وجہ تھی، وہاں کے مسلم طبقے کی عدم حمایت، بعد میں الفا نے نکسل وادیوں، ناگا باغیوں اور ماؤ وادیوں سے اپنے تعلقات استوار کر لیے اور اب ان کا آتنک پورے ہندوستان کو اپنی زد میں لیے ہوئے ہے، جس میں کوئی غریب مسلمان شامل نہیں۔

● شمال مشرقی ہند میں ہی چار دہائی قبل اٹھنے والے ''الگاؤ واد'' کے انقلاب نے بھی ایک عرصے تک ہندوستان کے طول وعرض میں کشت وخون کا بازار گرم رکھا۔۔۱۹۸۰ء میں علیحدہ ملک ''خالصتان'' کو لے کر پنجاب میں اٹھنے والی تحریک نے پورے ہندوستان میں دہشت گردی کی جو تاریخ رقم کی ہے وہ اتنی آسانی سے بھولی نہیں جاسکتی، پنجاب کی اسی تحریک نے ۱۹۸۴ء میں وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کو چتا پر لٹا دیا تھا۔ اس کے بعد ہندو سکھ فسادات نے کئی ریاستوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس کے نتیجے میں ہزاروں ہزار بے گناہوں کے لہو سے ہندوستان کی زمین سرخ ہوگئی، یہ فسادات آج بھی ہندوستان کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہیں، جن میں کسی مسلمان کا ہاتھ نہیں تھا۔

ان تمام تاریخی سچائی کی طرف ٹائمز آف انڈیا کے مشہور کالم نگار سوامی ناتھن ایئر نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> ''ہندوستان میں عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں، سکھوں یہاں تک کہ بدھسٹوں کے بہت سے گروپ تھے اور ہیں، جن سے ہندوستان کے ایک تہائی حصے کو مسلم دہشت گردوں سے زیادہ خطرہ ہے، بڑے شہر صرف مسلم گروپ سے خطرہ محسوس کرتے ہیں اور اسی لیے قومی قائدین اور زعما کی نظریں بھی مسلم دہشت گردی پر مرکوز ہوکر رہ گئی ہیں''۔

(ترجمہ انگریزی سے: سنڈے ٹائمز آف انڈیا، ۲۳ رجولائی ۲۰۰۶ء)

یہ تو ہندوستان کی دہشت گردی اور قتل وغارت گری کی مختصر تاریخ تھی، اگر بغاوت، مزاحمت، دہشت گردی اور خودکش حملے کی عالمی تاریخ پر بھی نظر ڈالی جائے تو یہ بھی عیسائیوں

اور یہودیوں کے نام ہوگی، جن کے آگ اگلنے والے ہتھیاروں نے پوری دنیائے انسانیت کو وہ زخم دیے ہیں جو سوکھنے کا نام نہیں لیتے -آیئے دہشت، بربریت اور خون سے لکھی اس تاریخ پر بھی نظر ڈال لیں-

●۱۸۸۱ء میں انارکیوں نے اپنی دہشت گردانہ کارروائیوں کے نتیجے میں روسی صدر تسر الیگزینڈر Tsar Alexander کو ماردیا جبکہ ۱۹۰۱ء میں امریکی صدر مائک کنلے Mckinley اور اٹلی کے بادشاہ، ہمبرٹ Humbart کو مارا اور جب پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تو انہوں نے آسٹریا کے حکمران Archduke Ferdiand کو ماردیا، لیکن اتنے بڑے پیمانے پر عوامی قتل وغارت گری کے ساتھ ساتھ ان بڑے حکمرانوں کے خون کا وبال کسی مسلمان کی گردن پر نہیں-

● تاریخ بتاتی ہے کہ گوریلا جنگ جوؤں میں ماؤزی دونگ Mao Zedong سے لے کے ہوچی من Hochi Minh اور فیڈل کیسٹرو Fidel Castro تک نے اپنی انقلابی تحریک کے دوران ہزاروں بے گناہ شہریوں کو مارا اور اربوں کی املاک کو ضائع کردیا، اس تحریک میں بھی کوئی مسلمان شامل نہیں تھا، لطف کی بات تو یہ ہے کہ جب تک انہیں فتح نصیب نہ ہوئی تھی دنیا انہیں دہشت گرد کہتی تھی لیکن جب یہ اپنی تحریک میں کامیاب ہوئے تو ہیرو اور جاں باز کہلائے-

●۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے بعد فلسطین میں یہودی گروپ ہگانہ، ارگن اور اوراسٹرن (Haganah, Irgan and Stern) نے علیحدہ یہودی ریاست کے لیے لڑائیاں لڑیں، سرکاری اور عام عمارتوں، ہوٹلوں کو بم سے اڑایا اور ہزاروں بے گناہ شہریوں کو قتل کیا، اس وقت برطانوی حکومت وہاں قابض تھی جس نے ان گروپ کو واضح طور پر دہشت گرد قرار دیتے ہوئے ان کے گرد زندگی کا حصار تنگ کردیا، یہاں بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہ تحریک کامیابی سے ہم کنار ہوئی تو ان باغی تنظیموں کے تمام دہشت گرد آزاد اسرائیل کے ہیرو اور لیڈر بن گئے۔ یہ دہشت گرد قائدین کوئی اور نہیں اسحٰق رابن، موسی دیان، منچم بیگن اور ایریل شرون تھے، جو آج اسی آزادی کے لیے لڑنے والے فلسطینی

مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیتے ہوئے، ان پر مظالم کے وہ پہاڑ توڑ رہے ہیں کہ اب ان کے اندر سے جینے کی آرزو ختم ہو چلی ہے۔

● جرمنی میں ۱۹۶۲ھ سے ۱۹۹۲ء تک بادر مین ہوف Baadr Menhoof گینگ نے پورے جرمنی میں اپنا خطرناک آتنک پھیلایا اور اس بیچ ہزاروں شہریوں یہاں تک کہ پرائی ویٹائزیشن ایجنسی کے سربراہ تری ہینڈ Treahand کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جرمنی میں نصف صدی تک قتل وغارت کی ہولی کھیلنے والے اس گینگ میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔

● افریقہ ایک عرصے تک داخلی نزاع اور خانہ جنگی کی وجہ سے تباہ و برباد رہا، لیکن پوری عالمی برادری انسانیت کی ارزانی پر خاموش تماشائی بنی رہی اور وہاں کے مختلف دہشت گرد تنظیموں کو پورے براعظم میں اپنی دہشت پھیلانے کا پورا موقع دیا۔ ان تمام دہشت گرد گروپوں میں سب سے خطرناک اگانڈا کی لورڈ سالویشن آرمی Lord's Salvation Army یعنی ''خدائی نجات کی فوج'' تھی، اس تنظیم کے بانی اور اراکین تمام کے تمام عیسائی تھے جو بچوں کو بھی اپنے مفادات کے لیے جنگجو کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

● سری لنکا میں تامل ٹائیگرس LTTE ہے جسے دہشت گرد تنظیموں میں سے ایک نہایت بدنام اور ممنوعہ تنظیم تسلیم کرلیا گیا ہے، یہ وہ پہلی دہشت گرد تنظیم ہے جو چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی دہشت گردی کی تربیت دیتی ہے۔ خودکش حملے Socide Bombing کو بڑے پیمانے پر عراقی اور فلسطینی مسلمانوں سے جوڑا جاتا ہے لیکن یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تامل ٹائیگرس ہی پہلی وہ دہشت گرد تنظیم ہے جس نے اپنی تخریبی کارروائیوں کے لیے خودکش حملے کو استعمال کیا، اسی خودکش حملے میں اس تنظیم کی ایک خاتون دہشت گرد نے ۱۹۹۱ء میں وزیراعظم راجیو گاندھی کے چیتھڑے اڑا دیے تھے۔

ان تمام تاریخی شواہد کے نتیجے میں اب مسلمان یہ کہنے کے مجاز ہیں کہ:

''تمام دہشت گرد صرف مسلمان نہیں بلکہ ہندو، سکھ اور عیسائی بھی ہیں''

All terrorists may not only be Muslims, but Hindu, Sikh

and Christians also.

رہی بات مسلم تنظیموں کی بنام جہاد دہشت گردانہ سرگرمیوں کی،تو اسلام سے ان کا کیا تعلق؟ مذہبی نظریات کی خودساختہ تشریحات اور تحریفات کے ذریعہ چلنے والی وہابیائی تحریک نے اب تک انہیں یہی بتایا کہ اس ''مجاہدے'' سے عرفان اور ایمان حاصل ہوتا ہے،مگر عالم اسلام کی اکثریت جو اعتدال پسندوں کی ہے، ان سرگرمیوں کو زوال اور عذاب سے تعبیر کرتی ہے-اب جب کہ دن کے اجالوں اور شب کے اندھیروں میں مغربی طاقتیں ان کے گرد اپنا شکنجہ کس رہی ہیں تو یہ اپنا مصلیٰ سمیٹنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں-

❑❑❑

مسلم دنیا کا ایک انوکھا سروے

اعتدال پسند اور شدت پسند مسلمان: اسلام کی توسیع اور مسلمانوں کے درمیان خالص توحید کی اشاعت کے لیے دو طریقے ہو سکتے ہیں: پہلا اعتدال پسندانہ اور دوسرا متشددانہ- پہلا اسلام کا مطلوب ہے اور دوسرے کی وہ سختی سے نفی کرتا ہے- حالانکہ ان دونوں طریق کار کے درمیان قدر مشترک اسلام کی اشاعت ہے، لیکن نتائج کے اعتبار سے ان دونوں کے درمیان بعد المشرقین ہے-ظہور اسلام سے اب تک بنام توحید جتنی بھی انفرادی یا اجتماعی کوششیں کی گئیں ان میں کامیابی اسی کے حصے میں آئی جس نے اعتدال، وعظ ونصیحت، صبر وشکر اور حکمت کے ساتھ کوشش کی -عہد رسالت سے اب تک تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں- جبکہ تشدد، عجلت، زبردستی اور جنگ وجدال کے ذریعے جن لوگوں نے دین کی سربلندی چاہی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اس کی دو مثالیں کافی ہیں- اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں نجد اور ہندوستان سے خالص توحید کی اشاعت کے لیے دو تحریکیں اٹھیں، ایک شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۷۰۳-۱۷۹۲ء) کی تحریک اور دوسری مولانا سید احمد رائے بریلوی (۱۷۸۶-۱۸۳۱ء) کی تحریک-اسلام کی تاریخ میں یہ دو تحریکیں ایسی ہیں جن میں بنام ''اصلاح توحید'' مسلمانوں پر ہی مظالم ڈھائے گئے اور شمشیر وسناں کے ذریعہ اپنا مطلوب پانے کی کوشش کی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کی تحریک بالاکوٹ کے میدان میں اپنے قائد کے ساتھ دم توڑ گئی اور دوسرے کی تحریک نے آل سعود کی سرپرستی میں اسامہ بن لادن اور ملا عمر جیسے ہزاروں متشددین کو جنم دیا، جو اپنی سرگرمیوں سے اسلام کے ساتھ، حکومت اور مسلمانوں کے لیے مسلسل آزار بنے ہوئے ہیں اور ان دو تحریکوں کے وجود سے

جو متشدد گروپ تیار ہوا، اس کے بعد امت مسلمہ دو حصوں میں بٹ گئی- ایک اعتدال پسندوں کا گروپ جو صوفی اسلام کی نمائندگی کرتا ہے اور دوسرا متشددین کا گروپ جو وہابی نقطۂ نظر کا حامی ہے، جس کی آمرانہ سرگرمیوں کا نقطۂ عروج ۱۱/۹ کا حادثہ ہے-

اکیسویں صدی کے آغاز میں ۹/۱۱ کے حادثے کے بعد اسلام اور مسلمان ایک نئے دور میں داخل ہوگئے، مغربی حکومتوں نے اس مسلسل آزار سے نپٹنے کے لیے اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے تعلیمی، فکری اقتصادی اور سماجی حالات کے جائزے کے لیے تحقیقات اور بحثوں کا آغاز کردیا، مشرق وسطیٰ، فلسطین اور مسلمانوں کے عمومی جائزے کے لیے سیمینار کیے گئے اور تعلیمی اداروں نے کثرت سے اسلام اور مسلم مسائل کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا- ان تحقیقات اور بحثوں سے مغربی حکومتوں کو جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو اعتدال پسندوں کا ہے وہ صوفی اسلام کی نمائندگی کرتا ہے، جن کی تعداد دنیا میں ۹۰٪ فیصد سے بھی زیادہ ہے، جبکہ بنام اسلام اپنی متشددانہ کارروائیوں سے کہرام مچانے والے وہابی نقطۂ نظر کے حامی ہیں، جن کی تعداد ۱۰٪ فیصد سے بھی کم ہے-

مغربی حکومتوں کے سامنے اب سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جو طبقہ ۹۰٪ فیصد سے بھی زیادہ ہے انہیں نہ تو حکومتوں کی سرپرستی حاصل ہے اور نہ وسائل، جبکہ مسلمانوں کی مجموعی تعداد کے اعتبار سے نہایت اقلیت میں ہونے کے بعد باوجود وہابی اسلام کے نمائندوں کی متشددانہ کارروائیوں کا اصل سبب یہ ہے کہ اسلام کے مراکز پر مسلط حکومت کی انہیں مالی اور سیاسی سرپرستی حاصل ہے اور قدرتی طور پر پٹرول کے ذخائر سے مالا مال ہونے کی وجہ سے ان کے پاس وسائل کی بھی کمی نہیں ہے- ایسی صورت حال میں ان کی متشددانہ کارروائیوں پر پابندی عائد کرنا ممکن نہیں رہ جاتا-

اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ پرامن طریقے سے مسلمانوں کے ساتھ دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ جس گروپ سے مسلمانوں اور دنیا کو نقض امن کا خطرہ ہے ان کا مذہبی وسیاسی نقطۂ نظر کیا ہے، وہ کس طبقے کی نمائندگی کررہے ہیں اور ان کی صحیح تعداد کیا ہے؟ اس مشن کے لیے انہوں نے تحقیقات، بحثوں، سیمیناروں، بین المذاہب کانفرنسوں، مکالموں

اور سروے کا آغاز کردیا ہے-

مسلم دنیا کا ایک انوکھا سروے: ۲۰۰۹ء کے اخیر میں جارج ٹاؤن یونیورسٹی امریکہ کا دی پرنس الولید بن طلال سینٹر فار مسلم کرسچین انڈر اسٹینڈنگ او ردی روئل اسلامک اسٹراٹجک اسٹڈیز سینٹر جورڈن نے پوری دنیا کے مسلمانوں کا سروے کیا اور ان کروڑوں مسلمانوں میں سے پانچ سو ایسے مسلمانوں کی ایک فہرست تیار کی جو عام مسلمانوں پر اپنے گہرے اثرات رکھتے ہیں- اس سروے کو مغربی حکومتوں کے مفاہمتی مشن کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے- اس سروے کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج مسلم دنیا کس طرح مختلف نقطۂ نظر کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے-

سروے کے تعارف Introduction میں اس بات کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

''یہ سروے مسلم دنیا کی اثر انداز اور انقلابی شخصیات کا ایک سرسری جائزہ ہے- ہم نے ان لوگوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جو بحیثیت مسلم اثر انداز ہیں- ان کی اثر اندازی خواہ اسلام پر عمل کرنے کی وجہ سے ہو یا صرف اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں- ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سروے مسلمانوں کی مختلف طریقے سے اثر اندازی کو اجاگر کرتا ہے اور اس بات کو واضح کرتا ہے کہ آج مسلمان کس طرح اور کس انداز میں مختلف نقطۂ نظر کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں-'' (انگریزی سے ترجمہ)

یہی وجہ ہے کہ اس سروے میں جہاں مسلم دنیا میں اپنی تعلیمی، سماجی، سیاسی، ادبی، ثقافتی، سائنسی اور تحریکی کاموں کی وجہ سے مختلف شعبوں سے سیکڑوں لوگوں کو شامل کیا گیا، وہیں Radical (بنیاد پرست) کے عنوان سے ان ۱۲/ افراد کو بھی شامل کیا گیا ہے جو بنام جہاد دہشت گردانہ سرگرمیوں میں مصروف ہیں، مثال کے طور پر اسامہ بن لادن، ملا عمر، بیت اللہ محسود، حافظ سعید، مولانا مسعود اظہر وغیرہ- ظاہر ہے کہ ان کی شمولیت اسلام کی خدمات کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ بنام مسلم ان کی سرگرمیوں کے اثرات کی بنیاد پر ہے- ۴۸۸/ افراد کے مقابلے میں مذکورہ ۱۲/ بنیاد پرستوں کی فہرست یہ بتاتی ہے آج بھی

مسلم دنیا میں اعتدال پسندوں کی تعداد ۹۰٪ فیصد سے بھی زیادہ ہے، جو دنیا میں امن وامان کے ساتھ ''جیو اور جینے دو'' کے فلسفے پر عمل پیرا ہیں-

سروے میں پانچ سو مسلمانوں کی فہرست میں ناموں کی ترتیب امت مسلمہ پر ان کے اثرات کے حساب سے رکھی گئی ہے- یہ بات ہمارے لیے نہایت فخر اور خوشی کی ہے کہ اس فہرست میں امین ملت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری زیب سجادہ خانقاہ برکاتیہ کا نام ۴۴ ویں نمبر پر ہے، یعنی جارج ٹاؤن یونیورسٹی امریکہ اور اسلامک سینٹر جورڈن کے سروے کے مطابق موصوف دنیا کی ۴۴ ویں موثر ترین مسلم شخصیت ہیں- اس سروے میں Top50 میں ان کا انتخاب اہل سنت وجماعت کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے-

اس سروے میں علی الترتیب Top25 اور Top50 مسلم شخصیتوں کو نمایاں جگہ دی گئی ہے- Top25 میں اکثریت مسلم حکمرانوں اور مذہبی شخصیتوں کی ہے- سروے میں پہلے نمبر پر سعودی حکمراں ملک عبداللہ بن عبدالعزیز ہیں جبکہ دوسرے نمبر پر ایران کے آیت اللہ سید علی خامنہ ای ہیں اور تیسرے، چوتھے اور پانچویں نمبر پر علی الترتیب مراکش، جورڈن اور ترکی کے حکمراں ہیں اور Top25 کی معروف مذہبی شخصیتوں میں آٹھویں نمبر پر شیخ ازہر سید محمد طنطاوی، نویں پر ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور دسویں نمبر پر مفتی اعظم مصر شیخ علی جمعہ ہیں-

اس سروے میں پانچ سو موثر ترین مسلم شخصیتوں میں سے ہندوستان سے پروفیسر سید محمد امین میاں کے علاوہ مزید ۹ رلوگوں کا انتخاب کیا گیا ہے، جن کے اسمایہ ہیں: ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام سابق صدر جمہوریۂ ہند، بوہری لیڈر ڈاکٹر سیدنا محمد برہان الدین، شیخ ابوبکر مسلیار، اصغر علی انجینئر، شاہ رخ خان، مولانا وحید الدین خان، مولانا محمود مدنی، ڈاکٹر ذاکر نائک اور اے آر رحمٰن- خوشگوار حیرت کی بات یہ ہے کہ اس فہرست میں امین میاں کے ساتھ مولانا محمود مدنی اور سیدنا محمد برہان الدین کے علاوہ کوئی بھی Top50 میں جگہ نہیں پا سکا-

انتخاب کا سبب: خانقاہی روایتوں میں ''انسانیت کی دست گیری، حسن سلوک اور سماجی خدمت'' کے تصور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے- انہی روایتوں نے ہر دور میں

خانقاہوں کو مقبول بنایا، انہی عناصر نے اہل خانقاہ کے ذریعے بالواسطہ اسلام کی توسیع میں بنیادی کردار ادا کیا اور انہی روایتوں نے اہل خانقاہ پر وسائل کے دروازے کھولے جن کے ذریعے بڑے پیمانے پر دین وملت کی خدمت انجام دی گئی- مشاہدہ بتاتا ہے کہ آج جن خانقاہوں نے اپنی ان بنیادی روایتوں سے صرف نظر کیا اور اپنی مقبولیت اور وسائل کو اپنی ذات میں سمیٹنے کی کوشش کی وہاں درگاہیں تو آباد ہیں، لیکن گھرانے ویران ہو گئے، کیونکہ تعلق کی اساس Give and Take پر ہے، جہاں یہ اساس ختم ہوتی ہے وہاں سے تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے- تعلق کی استواری اور لوگوں پر اثرات نہ علمی رعب و دبدبے پر قائم ہو سکتے ہیں، نہ حسب ونسب کی نمائش پر اور نہ آباء واجداد کی خدمات کے نام پر- تعلق ذاتی خدمات چاہتی ہے-

تعلق کی اسی اساس کی وجہ سے آج درگاہوں کے ساتھ جو گھرانے بھی آباد ہیں ان میں ایک نمایاں نام سلسلہ قادریہ کی اہم خانقاہ، خانقاہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کے زیدی سادات کا ہے، جو پچھلی پانچ صدیوں سے امت کی شیرازہ بندی اور اصلاحات کے لیے کام کر رہا ہے- اس گھرانے کا نمایاں وصف یہ ہے کہ جیسے جیسے ان کی مقبولیت اور وسائل کا گراف بڑھتا گیا، امت کی اصلاح وترقی کے لیے ان کی جد وجہد کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا- خصوصیت کے ساتھ پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں کی قیادت میں اس گھرانے نے پچھلی ایک دہائی میں مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور سماجی اصلاحات کے لیے جس طرح انفرادی اور اجتماعی اعانت کی ہے، اس نے انہیں مقبولیت کی بلندی پر پہنچا دیا ہے اور آج انہی خدمات کا نتیجہ ہے کہ غیر جانبدارانہ طور پر امین ملت کا شمار دنیا کی ۴۴ ویں موثر ترین شخصیت کی حیثیت سے کیا جا رہا ہے- چنانچہ سروے میں اس کا اظہار یوں کیا گیا ہے:

''پروفیسر سید محمد امین میاں قادری ہندوستان میں بریلویوں کے قائد و پیشوا اور مقتدر صوفی رہنما شیخ عبدالقادر جیلانی (۱۱۶۶-۱۰۷۷ء) کے سلسلۂ قادریہ کی ایک شاخ سلسلۂ برکاتیہ کے سجادہ نشین اور روحانی وارث ہیں............

ایک اہم صوفی تحریک کے قائد: پروفیسر سید محمد امین قادری ہندوستان کی باوقار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں اور ایک ایسے پر تشدد علاقے میں جہاں مذہب کو تشدد کے لیے استعمال کیا گیا ہے، وہاں جنوبی ایشیا کے ایک صوفی تحریک کے قائد ہیں- یہ صوفی تحریک ایک فعال اور سماجی طور پر سرگرم تحریک ہے-''بریلوی'' ایک غیر سیاسی جماعت ہے، جس کا سارا زور سماجی ہم آہنگی اور روحانی ترقی پر ہے-'' (ص:۹۷)

سروے رپورٹ کا انکشاف: مذکورہ سروے رپورٹ ۱۹۵ صفحات پر مشتمل جدید تحقیقی انداز میں ایک کتاب کی شکل میں سامنے آئی ہے، جس کا نام ہے: The 500 most influential muslims in the world (دنیا کے پانچ سو موثر ترین مسلمان) یہ سروے مسلم شخصیتوں پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام ممالک میں مسلمانوں کے اعداد وشمار، عقائد اور مسالک کی بنیادوں پر مسلمانوں کی تقسیم اور ان کی تعداد و اثرات کا بھی سروے ہے، جس کے مطالعے سے خوشگوار حیرت ہوتی ہے-

اس سروے میں مسلمانوں کی نظریاتی تقسیم کرتے ہوئے واضح طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ سنی اور شیعہ فرقوں پر مشتمل روایتی اسلام پر گامزن اعتدال پسندوں کی تعداد پوری مسلم دنیا میں ۹۶٪ فیصد ہے، جن کا نظریہ اور طریق کار سیاست زدہ نہیں اور وہ متفقہ طور پر صحیح اسلام کی نمائندگی کر رہے ہیں- جبکہ ان کے بالمقابل بنیاد پرستوں کی تعداد مسلم دنیا میں محض ۳٪ فیصد ہے جن کا مذہبی عقیدہ ونظریہ کلی طور پر سیاست زدہ (Politicized) ہے، جن کی شہرت بیسویں صدی میں مختلف تحریکوں کے ذریعے ہوئی اور جو روایتی اور اعتدال پسند مسلمانوں کے خلاف جارحانہ تیور لے کر اٹھے- جبکہ مسلم دنیا میں جدیدیت پسند مسلمانوں کی تعداد صرف ۱٪ فیصد ہے، جن کا ظہور سلطنت عثمانیہ میں ترکی اور مصر کے اندر ہوا، یہ طبقہ مغرب کے صنعتی انقلاب سے متاثر ہو کر کلی طور پر مغربی تہذیب وثقافت میں اپنے آپ کو رنگ لیا اور پھر رفتہ رفتہ اسلامی آئیڈیالوجی سے دست بردار ہو کر کمیونزم کا حامی ہو گیا-

لطف کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی نظریاتی تقسیم میں جن ۳٪ فیصد بنیاد پرستوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے، لیکن سروے رپورٹ میں ایک دوسرے مقام

پر Islamic Fundamentalism (اسلامی بنیاد پرستی) کے عنوان سے جن متشدد گروہوں کی نشاندہی کی گئی ہے، ان میں صرف دو کا نام ہے- ایک مصر کی اخوان المسلمین، جس کی بنیاد ۱۹۲۸ء میں حسن البناء نے رکھی اور دوسرا وہابی رسلفی گروہ جس کی بنیاد نجد میں محمد بن عبدالوہاب نے ڈالی-

اس سروے رپورٹ کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعتدال پسند صوفی اسلام کے بالمقابل بنیاد پرست وہابی اسلام کی تعداد صرف ۳٪ فیصد ہے، جو ظاہر ہے کہ اسلام کے نمائندے نہیں ہو سکتے- ایسے میں اب ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ عالمی سطح پر اگر اعتدال پسند اسلام کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تو ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے فکر و عمل سے اس شبیہ کو اور نمایاں کرنے کی جدوجہد کریں- اسی میں اسلام کی ترقی بھی ہے اور مسلمانوں کی فلاح بھی-

